چھوٹی، ناشر خواجہ اولاد کمپنی دہلی، قیمت غیر مجلد عہ، مجلد ہجر

جناب خواجہ حسن نظامی صاحب دہلوی کی روزنامچہ نویسی کو عام شہرت حاصل ہے، خواجہ صاحب موصوف نے اسی انداز میں تزک جہانگیری کا اردو ترجمہ "جہانگیر کا روزنامچہ" کے نام سے شائع کیا ہے، جس میں جہانگیر کی پیدائش سے تخت نشینی تک کے حالات قلمبند ہو گئے ہیں، خواجہ صاحب نے اس کو تزک کے دونوں نسخوں کو سامنے رکھکر مرتب کیا ہے، اور بعض جگہ کسی چشتیہ نام کی کتاب سے اضافے بھی کئے ہیں، اور بعض مقامات پر حسب ضرورت مفید حاشیے اور تعلیقات بڑھائے ہیں، مجموعی حیثیت سے اس میں جہانگیر کے سوانح حیات دلکش انداز میں قلمبند ہو گئے ہیں، یہ رسالہ خصوصاً اسکول کے طلبہ کے لئے مفید ہوگا، امید ہے کہ اس سے فائدہ اٹھایا جائے گا،

گلبانگِ حرم از جناب حمید صدیقی لکھنوی ضخامت ۱۴۴ صفحے قیمت ے پتہ: مکتبہ جامعہ امین آباد لکھنؤ

گلبانگِ حرم زائر حرم حضرت حمید صدیقی لکھنوی کی پر کیف نعتیہ نظموں کا ایک دلکش مجموعہ ہے جن میں بڑی روانی، شگفتگی، اور ادب شناسی، اس کے ساتھ کمال سرشاری و سرمستی سے بارگاہ نبوت میں عقیدت و محبت سے لبریز جذبات کی نذر پیش کی گئی ہے، ان میں سے مختلف نظمیں، مختلف شعراء کی نظموں یا غزلوں پر بھی کہی گئی ہیں، اور حضرت جگر اور بعض دوسرے شعراء کو بعض مصرع بھی شاعر کی زبان پر آ گئے ہیں مثلاً بینظیر شاہ کا شعر ہے

ادھر ڈھونڈھتی ہے اُدھر ڈھونڈھتی ہے ... کسے ہر طرف چشمِ تر ڈھونڈتی ہے

حمید صاحب فرماتے ہیں:-

ادھر ڈھونڈتی ہے ادھر ڈھونڈتی ہو ... خدا جانے کس کو نظر ڈھونڈتی ہے،

کتاب پر مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی جناب جگر مرادآبادی، حضرت امجد حیدرآبادی اور مولانا مناظر حسن گیلانی نے حوصلہ افزا تقریظیں لکھی ہیں اور شروع میں جناب عبد الغنی صاحب نے "زائر حرم" کے عنوان سے شاعر کی زیارت حرم کی روداد قلمبند کی ہے، امید ہے کہ اہلِ ذوق کے حلقہ میں یہ مجموعہ مقبول ہوگا،

"س"

جلد ۶۰ ماہ رمضان المبارک ۱۳۶۶ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۴۷ء عدد ۲

مضامین

*

شذرات

ہندوستان مین دو سو برس کی برطانوی حکومت کی تاریخ کا آخری باب ۱۵ اگست ۴۷ء کو ختم ہوجائے گا، قومون اور ملکون کی تاریخ مین ایسے جشن مسرت کے موقعے شاذ و نادر آتے ہین، اس دن ہندوستان کا ہر باشندہ خواہ وہ اس کے حصہ "انڈیا" کا رہنے والا ہو، یا نو قائم حکومت "پاکستان" کا، دنیا کی آزاد قومون کے افراد کے دوش بدوش کھڑا ہوگا، اور آزاد انڈیا اور پاکستان، دوسرے آزاد ملکون کی طرف سے تہنیت کے پیامات وصول کرین گے، اور جشنِ مسرت منائین گے،

معارف کی اشاعت ہر مہینے کی پندرہ تاریخ کو ہوتی ہے، اس ماہ کا پرچہ جب شائع ہوگا آزادی کی صبح طلوع ہوچکی ہوگی، اور اُسی دن ملک کے طول و عرض مین دو سو برس کے سامراجی جھنڈے سرنگون کرکے اُتارے جائین گے، اور ان کی جگہ دو نو قائم حکومتون کے وہ قومی پرچم حکومت کے ایوانون پر لہرائے جائین گے، جن کو ان حکومتون کے رہنے والے شہریون نے خواہ وہ اکثریت کے فرقہ کے ہون یا اقلیت کے، عام اتفاق سے نشانِ عزت مان لیا ہے، ہم اپنے ماہنامہ کی تاریخ اشاعت کے فائدہ اٹھاکر ان سربلند ہونے والے پرچمون کا دلی مسرت اور فخر سے خیر مقدم کرتے ہین، کہ وہ ہمارے سالہا سال کی جد وجہد کا مآل اور ایک مدت کی تمناؤن کے خواب کی تعبیر ہین، نیز ہم جنگ آزادی کے ان سرفروش جانبازون کو عقیدت کے پھول نذر کرتے ہین، جو اگرچہ اب ہمارے درمیان موجود نہین، مگر اُن کے روشن کارنامون سے ان کی یاد تازہ ہے، اور ان پرچمون کے ان لہرانے والون کی خدمت مین جوشِ مسرت و عقیدت کے ساتھ خراجِ تحسین پیش کرتے ہین، جن کی مدبرانہ حکمت عملیون اور شبانہ یوم جد وجہد سے یہ روز سعید دیکھنے مین آیا، اور اب جن کے ہاتھون مین اس ملک کے مستقبل کی تعمیر کی عنان ہوگی،

برطانوی سامراج سے آزادی حاصل کرنے والے ملکون امریکہ، آئرلینڈ، اور مصر، اور دوسری طرف ہندوستان کی آزادی کی لڑائی اور اس کے نتیجہ مین اگرچہ بعض مماثلتین پائی جاتی ہین، لیکن

ہندوستان کی ۳۰ سالہ جد وجہد کی یہ امتیازی شان رہی ہے، کہ یہان کی تحریک عدم تشدد کے اصول پر چلائی گئی، اور آج دنیا کی عام روش کے خلاف حکومت کے اختیارات پرامن طریقہ سے اس ملک کے رہنے والون کے ہاتھون مین منتقل ہو رہے ہین، خوش قسمت ہین وہ رہنما اور وہ رہرو جو اس امن کی راہ سے منزل مقصود کو پہنچے ہین،

آزادی کی جد وجہد کے اس تیس برس کے مختصر وقفہ مین سیاست کے طوفان مین مختلف اوتار چڑھاؤ آیا کئے، اور اگرچہ ادھر چند سال سے مسلمانون کی اکثریت ایک سیاسی جماعت سے ناراض رہی لیکن یہ حقیقت تاریخ کے صفحہ سے مٹائی نہین جاسکتی، کہ ہندوستان کی آزادی کی لڑائی مین مسلمانون نے لگاتار بیش از بیش حصہ لیا، اور اپنی ناقابلِ فراموش قربانیان پیش کین، آج جس طرح بال گنگادھر تلک، پنڈت موتی لال نہرو، مسٹر سی آر داس اور لالہ لاجپت رائے کے عزیز خدمات کی یاد تازہ ہوگی، اسی طرح حضرت مولانا محمود الحسن، مسیح الملک حکیم اجمل خان، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مسٹر مظہر الحق، مولانا عبد الباری، فرنگی محلی، مسٹر حسن امام، مولانا محمد علی، مولانا ابو المحاسن محمد سجاد اور مولانا شوکت علی (اللہ تعالیٰ ان کی تربتون کو ٹھنڈا رکھے) کی روحین خوش ہون گی، کہ انھون نے جس نصب العین کے حاصل کرنے کے لئے زندگی بھر اپنی جد وجہد جاری رکھی، اور مصیبتین جھیلین، بالآخر اُن کے اخلاف اس مقصد عزیز کو حاصل کرنے مین کامیاب ہوگئے،

دوسری طرف مسلمانون کے ایک دوسرے مکتبِ خیال کے ارباب حل و عقد نے ۱۹۰۶ء مین ہندوستان کی اصلاحات اور آزادی کے ثمرات مین سے مسلمانون کے جداگانہ حقوق و اختیارات کی تعین کے لئے سیاسی مجلس کی بنا ڈالی تھی، ملک مین ہندو مسلم اختلافات کی تاریخ پر نظر رکھنے والے جانتے ہین کہ اگر بعض موقعون پر اکثریت کے فرقہ والون کے رہنماؤن سے بعض لغزشین نہ ہوئی ہوتین، تو معلوم نہین کب یہ مسئلہ طے ہوچکا ہوتا، لیکن کشمکش کے پیہم جاری رہنے، اور حالات کے بدل جانے سے اس مجلس مین سرفروش و آزمودہ کار جانباز بھی داخل ہوگئے، اور اس مجلس کی ہیئت ترکیبی بدل گئی، اور اس نے اپنا نصب العین ایک جداگانہ ریاست کا قیام قرار دے لیا، اور جو بالآخر ایک کامیاب قیادت مین پورا ہوا، مبارک ہو مسلمانانِ پاکستان کو کہ وہ فائز المرام ہوئے، اور مسلمانون کی ایک نئی سلطنت کا وجود عمل مین آیا،

اگرچہ یہ افسوسناک حقیقت ہے کہ جب سات سال کی مسلسل جد وجہد اور مذہبی منافرت کے پھیل جانے کی

وجہ سے ہزاروں ہزار مسلمانوں کے جام شہادت نوش کر لینے کے بعد نتیجہ برآمد ہونے کا موقع سامنے آیا، تو دوسری طرف سے تقسیم در تقسیم کی تحریک اٹھائی گئی، اور صرف تین مہینے کی تگ و دو میں وہ بھی منظور کر لی گئی، —

یہی سبب ہے کہ آج اس تاریخی موقع پر ملک میں حقیقی مسرت کی عام لہر موجود نہیں، ملک کا ایک طبقہ اس سے اگر اس لئے مایوس ہے کہ ایک متحد ملک دو حصوں میں تقسیم ہو گیا، اور آزاد ہونے کی متحدہ وفاقی حکومت قائم کرنے کی کوششیں رائگاں گئیں، تو دوسرے حلقہ میں اس لئے کامل مسرت نہیں کہ ان کی اکثریت کے وہ صوبے جو اصل جان تھے، تقسیم ہو گئے، بایں ہمہ دونوں طبقوں کے نصب العین حاصل ہوئے، ایک تقسیم شدہ ہندوستان لیکن وہ آزاد ہوا، اور ایک ادھورا پاکستان — بہرحال وہ قائم ہو گیا،

دنیا کے انقلابات کی تاریخ میں مختلف قوموں طبقوں اور جماعتوں کی کشمکش میں تلخیوں کا پیدا ہونا کوئی نئی بات نہیں، یہ صحیح ہے کہ اقلیتوں کا مسئلہ ابھی جیوں کا تیوں لاینحل پڑا ہے، اور بعض ممتاز ہندو قوم پرور جو ساری عمر اپنے مسلک میں راسخ العقیدہ رہے، اس موقع پر اپنے کو سنبھالے رکھنے میں کامیاب نہیں رہے، اور اس منصوبہ کے ردعمل کے طور پر اشتعال اور جذبۂ انتقام میں ہندوستانی زبان کے بجائے ہندی کو "قومی" زبان قرار دینے اور انڈین یونین میں رہنے والی اقلیت کے شہری حقوق تک پر پابندیاں لگانے کی آواز اٹھا رہے ہیں، یہ افسوس کی بات ہے کہ وہ اس طوفانی سیلاب میں اپنا دامن بچا نہ سکے، لیکن ہمیں اُمید ہے کہ اُن کے یہ وقتی اور جذباتی تاثرات سیاسیات کے طوفانی بحران کے خاتمہ پر ختم ہو جائیں گے، کہ ملک کو ترقی اور نئی تعمیر کی راہ پر لگانا ہے تو جذبات، خیالات اور عام حالات میں سکون پیدا کرنے کی ضرورت ہوگی، نیز یہ خوشی کی بات بھی ہے کہ بعض حلقوں میں پچھلی تلخیوں کی یاد کو فراموش کر دینے کا جذبہ بھی پیدا ہو چکا ہے، اور یہ احساس پیدا ہو رہا ہے کہ ان سیاسی جماعتوں نے وقت اور ماحول سے متاثر ہو کر اس منصوبہ کو دونوں نو قائم حکومتوں میں تلخیوں اور اختلافات کو برقرار رکھنے کے بجائے پائدار امن اور دوستی قائم کرنے کے لئے قبول کیا ہے، توقع ہے کہ ایک وہ دن بھی آئے گا جب پچھلی کدورتیں مٹ جائیں اور انتقام کے جذبات فنا ہو جائیں، کہ جب روز بروز کے نئے معاشی مسائل سامنے آئیں گے اور دونوں ریاستوں کی نگاہیں وسائل ترقی پر مرکوز ہوں گی، تو پھر انتظامی امور میں ہم آہنگی پیدا کرنے اور باہم ایک دوسرے کی خیرسگالی کی آرزومند رہنے کی ضرورت محسوس ہوگی، کہ ان کی متحدہ کوششوں سے اس ملک کی پچھلی شاندار روایات زندہ ہوں، اور دنیا کی قوموں میں اس کو بلند مرتبہ حاصل ہو،

اسلامی ہند کی تاریخ کا وسیع سلسلہ جو دار المصنفین میں زیر تالیف ہے، یہ فال نیک ہے کہ اس کی پہلی جلد تاریخ سندھ اس وقت شائع ہو رہی ہے، جب سندھ اسلامی ہند کا نیا مرکز حکومت بن رہا ہے، یہ سندھ کے اسلامی فتوحات کی پہلی مفصل تاریخ ہے، اور اس موقع پر خاص طور سے مطالعہ کے قابل ہے،

مقالات

اقبال کا فلسفۂ خودی

از

مولانا عبد السلام صاحب ندوی

(۵)

لیکن ڈاکٹر صاحب نے جس عشق کے مقابل میں عقل کو شکست دی ہے، وہ رندانہ عشق سے بالکل مختلف ہے، رندانہ عشق اور عقل میں تضاد کلی ہے اس لئے دونوں کا اجتماع ایک جگہ نہیں ہو سکتا، اور اسی بنا پر خواجہ حافظ فرماتے ہیں :-

بر ہوشمند سلسلہ ننہادہ است عشق — خواہی کہ زلف یار کشی ترک ہوش کن

دل اندر زلف لیلیٰ بند و کار عشق مجنون کن — کہ عاشق را زیان دارد مقالات خردمندی

اے کہ از دفتر عقل آیت عشق آموزی — ترسم این نکتہ بہ تحقیق ندانی دانست

لیکن چونکہ اس عشق میں جیسا کہ خواجہ حافظ فرماتے ہیں،

ایکہ دایم بخویش مغروری
گر ترا عشق نیست معذوری

خودی قائم نہیں رہ سکتی، اور ڈاکٹر صاحب عشق کو خودی کی ترقی کا ذریعہ سمجھتے ہیں،

بہر دل عشق رنگ تازہ بر کرد گہے با سنگ و گہہ با شیشہ سر کرد

ترا از خود ربود و چشم تر داد مرا با خویشتن نزدیک تر کرد

اس لئے وہ اس خود فراموشانہ عشق کو عقل کا حریف مقابل نہین قرار دیکتے، بلکہ انھون نے جس عشق کو عقل کا حریف مقابل قرار دیا ہے، وہ عقل و ہوش سے خالی نہین ہے، اور یہی عشق ہے جس کی تعبیر انھون نے جنون صاحب ادراک، جنونِ فرزانہ اور جنونِ زیرک سے کی ہے، اور چونکہ عام طور پر جنون کی حالت مین عقل باقی نہین رہتی اس لئے جنون کو صاحبِ عقل و ادراک قرار دیکر ایک شاعرانہ لطافت بھی پیدا کر دی ہے،

زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعلِ راہ کسے خبر کہ جنون بھی ہے صاحبِ ادراک

چمن بہ زاغان جنون ویرانہ گردد کہ از ہنگامہ ہا بیگانہ گردد

ز دانہ جوے کہ انگندم درین شہر جنون ماند و لے فرزانہ گردد

دگر آئین تسلیم و رضا گیر طریق صدق و اخلاص و وفا گیر

مگو شعرم چنین است و چنان نیست جنونِ زیرکے از من فرا گیر

زمانۂ عشق مین معشوق جس قدر معزز و موقر ہوتا ہے، اسی قدر عاشق ذلیل و خوار ہوتا ہے، اور اپنی ذلت و خواری پر ناز کرتا ہے، اسی نظریہ کے مطابق خواجہ حافظ فرماتے ہین،

گرچہ بدنامی است نزد عاقلان

ما نمی خواہیم ننگ و نام را

اردو کا ایک شاعر کہتا ہے:-

ہمین دیکے ذلت وہ محفل مین اپنی

معزز کرین گے گرامی کرین گے

لیکن ڈاکٹر صاحب کے نزدیک عشق بجائے خود ایک عز و شرف ہے، اور اس کا آخری درجہ شہادت ہے، ذلت کی زندگی نہین ہے،

عشقِ بتان سے ہاتھ اٹھا اپنی خودی مین ڈوب جا نقش و نگار دیر مین خونِ جگر نہ کر تلف

کھول کے کیا بیان کرون سرِ مقام مرگ و عشق عشق ہے مرگ با شرف مرگ حیات بے شرف

اگرچہ اس عشق با شرف مین بھی بعض اوقات سلبی اخلاق مثلاً صبر و تحمل، تواضع و انکسار اور عفو و درگذر سے کام لینا پڑتا ہے، اور مکہ معظمہ مین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کی زندگی، اسی قسم کے سلبی اخلاق کا نمونہ تھی، اور ہمارے صوفیہ نے اپنے لئے اسی زندگی کو اسوۂ حسنہ بنایا ہے، لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو در اصل اس مکی زندگی اور صوفیہ کی اخلاقی زندگی مین ذوقی طور پر نہایت دقیق فرق نظر آتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے صبر و تحمل تواضع و انکسار، اور عفو و درگذر مین عجز و ذلت کا شائبہ نہ تھا، بلکہ ان مین بھی مجاہدانہ شان موجود تھی، اور مکہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت فرار نہ تھی، بلکہ جہاد کی تیاری کا مقدمہ تھی، اور ڈاکٹر صاحب نے اس اخلاقی فرق کو نہایت لطیف شاعرانہ انداز مین اس طرح بیان کیا ہے،

کہہ گئین راز محبت پردہ داریہائے شوق

تھی فغان وہ بھی جسے ضبطِ فغان سمجھا تھا مین

اس لئے یہ عشق کبھی عملی طاقت سے خالی نہین ہوتا، البتہ کبھی یہ طاقت بالقوۃ ہوتی ہے، اور کبھی بالفعل، لیکن اس مین عملی طاقت ہر حالت مین موجود رہتی ہے،

عقل در پیچاک اسباب و علل عشق چوگان باز میدانِ عمل

اور جب قوت سے فعل مین آتی ہے، تو قوم کے سامنے ترقی کا وسیع میدان کھل جاتا ہے، لیبان نے لکھا ہے کہ قومی زندگی کی بنیاد صرف اخلاق ہی کے ستون پر قائم ہے، عقل و دماغ

کا حصہ اس مین بہت کم ہے، رومن قوم اپنے تنزل و انحطاط کے زمانے مین عقلی حیثیت سے اپنے آبا و اجداد کی بہ نسبت زیادہ طاقتور تھی، تاہم چونکہ اپنی آبائی وراثت یعنی اقدام، عزم، شجاعت، جانبازی، غرض ان تمام اخلاق کو جن کے ذریعہ سے اُن کے آبا و اجداد نے ترقی کی تھی کھو چکی تھی، اس لئے بالآخر تنزل کے غار مین گر پڑی، بعینہٖ یہی حال مسلمانون کا بھی ہوا، وہ اپنے دورِ تنزل مین عقلی حیثیت سے اہلِ عرب سے بہت زیادہ ترقی یافتہ تھے، لیکن چونکہ اہل عرب جیسی اخلاقی اور عملی طاقت نہین رکھتے تھے، اس لئے اُن کو اپنے مفتوحہ ممالک سے بھی ہاتھ دھونا پڑا،

لیکن عقلی ترقی اس عملی قوت کا بالکل خاتمہ کر دیتی ہے،

انجام خرد ہے بے حضوری ہے فلسفۂ زندگی سے دوری
افکار کے نغمہ ہاے بے صوت ہین ذوقِ عمل کے واسطے موت
قوم کے ہاتھ سے جاتا ہے متاعِ کردار بحث مین آتا ہے جب فلسفۂ ذاتِ صفات

کیونکہ :-

(۱) عمل کی بنیاد عقیدہ کی وحدت و یکرنگی پر قائم ہوتی ہے، اسلام نے صرف ایک کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ کی دعوت دی، اور اسی عقیدہ کی وحدت اور یکرنگی نے صحابہ کرام کو جوشِ عمل سے لبریز کر دیا، لیکن عقلی نظریون مین یہ وحدت و یکرنگی نہین پائی جاتی، بلکہ وہ ہمیشہ بدلتے رہتے ہین،

بیا کہ عشق مسلمان و عقل زناری است زمان زمان شکند آنچہ می تراشد عقل

عقل عیار ہے سو بھیس بدل لیتی ہے عشق بیچارہ نہ مُلّا ہے، نہ زاہد نہ حکیم

اس لئے وہ انسان کی عملی طاقت کو کسی ایک مرکز پر جمع نہین ہونے دیتی، بلکہ اس کو منتشر رکھتی ہے،

(۲) اس وحدت و یکرنگی کے ساتھ عقیدہ کے لئے استحکام اور پختگی بھی ضروری ہے، جس کو شریعت

کی اصطلاح مین ایمان و یقین کہتے ہین، اور یہی ایمان و یقین انسان کو آمادۂ عمل کرتا ہے، لیکن ایک طرف تو عقلی نظریات کا یہ اختلاف انسان کے دل مین یقین و ایمان پیدا نہین ہونے دیتا، بلکہ اس کو تلون تذبذب اور شک مین مبتلا رکھتا ہے، دوسری طرف ان نظریات کو سینکڑون دلائل سے ثابت کیا جاتا ہے، اور انسان اگرچہ ان دلائل کی کثرت سے حیرت زدہ ہو جاتا ہے،

اک دانش نورانی اک دانش برہانی
ہے دانش برہانی، حیرت کی فراوانی

لیکن اس کے دل مین یقین کی کیفیت نہین پیدا ہوتی، جس پر عمل کی بنیاد ہے،

غریب اگرچہ ہین رازی کے نکتہ ہاے دقیق علاج ضعف یقین اُن سے ہو نہین سکتا

بلکہ وہ ایک کشمکش مین مبتلا ہو جاتا ہے، اور اس حالت مین بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ عقل اُن دلائل سے انسان کی رہبری کرنا چاہتی ہے، لیکن درحقیقت وہ راہزنی کرتی ہے، یہی وجہ ہے، کہ ڈاکٹر صاحب ان دلائل کو مکر و فریب اور حیلہ قرار دیتے ہین،

فریب کشمکش عقل دیدنی دارد کہ میرِ قافلہ و ذوقِ رہزنی دارد
نشان راہ ز عقلِ ہزار حیلہ مپرس بیا کہ عشق کمالے ز یک فنی دارد

عقل مکار است و دامے می زند عشق صید از زورِ بازو افگند

(۳) ایک طرف تو علم و یقین کا یہ ضعف عقل کو عملی میدان مین ناکامیاب رکھتا ہے، دوسری طرف عملی زندگی مین جو خطرات و مہالک پیش آتے ہین، اُن کے مقابلے کے لئے جس جرأت، استقامت، اور جانبازی کی ضرورت ہوتی ہے، وہ عقل مین بہت کم پائی جاتی ہے، عشق آگ مین نہایت بےباکی کے ساتھ کود پڑتا ہے، لیکن عقل دیکھ بھال مین رہ جاتی ہے،

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود مین عشق عقل ہے محوِ تماشاے لب بام ابھی

کیونکہ عشق خود ایک آگ ہے، جو دل میں زندگی کی حرارت پیدا کر دیتا ہے، اس لئے آگ کو آگ سے کیا خطرہ ہو سکتا ہے، لیکن عقل میں زندگی کی یہ حرارت نہیں پائی جاتی، اور ڈاکٹر صاحب نے ایک فرضی اور خیالی حکایت میں اس نکتہ کو نہایت لطیف شاعرانہ انداز میں بیان کیا ہے،

شنیدم شبے در کتب خانۂ من — بہ پروانہ می گفت کرم کتابی

باوراق سینا نشیمن گرفتم — بسے دیدم از نسخۂ فاریابی

(بو علی سینا)

نفہیدہ ام حکمتِ زندگی را — ہمان تیرہ روزم زبے آفتابی

نکو گفت پروانۂ نیم سوزے — کہ این نکتہ را در کتابے نیابی

تپش می کند زندہ تر زندگی را — تپش می دہد بال و پر زندگی را

اس لئے اگرچہ عقل بھی بڑے بڑے میدان فتح کرنا چاہتی ہے، لیکن جرأت و ہمت کی کمی سے وہ دفعۃً ان میدانوں کو فتح نہیں کر سکتی، بلکہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہے،

عقل ہم خود را بدین عالم زند — تا طلسم آب و گل را بشکند

می شود ہر سنگ رہ او را ادیب — می شود برق و سحاب او را خطیب

چشمش از ذوقِ نگہ بیگانہ نیست — لیکن او را جراتِ رندانہ نیست

پس ز ترسِ راہ چون کورے رود — نرم نرمک صورت مورے رود

تا خود پیچیدہ تر ہر رنگ و بوست — می رود آہستہ اندر راہ دوست

کارش از تدبیر می یابد نظام — من ندانم کے شود کارش تمام

لیکن جرأت و ہمت کی کمی سے عقل جو کام برسوں میں کرتی ہے، اُس کو عشق آن کی آن میں کر سکتا ہے،

می نداند عشق سال و ماہ را — دیر و زود و نزد و دور راہ را

عقل در کوہے شگافے می کند — یا بگرد او طوافے می کند

کوہ پیشِ عشق چون کاہے بود — دل سریعُ السیر چون ماہے بود

زورِ عشق از باد و خاک و آب نیست — قوتش از سختیِ اعصاب نیست

عشق با نانِ جوین خیبر کشاد — عشق در اندامِ مہ چاکے نہاد

کلۂ نمرود بے ضربے شکست — لشکرِ فرعون بے حربے شکست

عشق سلطان است و برہانِ مبین — ہر دو عالم عشق را زیر نگین

اس تمام تفصیل سے ثابت ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے جس عشق کو عقل کا حریفِ مقابل قرار دیا ہے وہ بے کار رندوں اور اوباشوں کا مشغلہ نہیں بلکہ عقل و اخلاق کا مجموعہ ہے، اور عقل و اخلاق کی آمیزش نے اُس کو ایک معجزانہ عملی طاقت بنا دیا ہے، اس زمانہ میں گرچہ سائنس بھی ایک عملی طاقت بن گئی ہے لیکن بااین ہمہ سائنس اور عشق میں مختلف حیثیتوں سے فرق ہے،

(۱) سائنس میں اخلاق کی آمیزش نہیں، اس لئے وہ زندگی کے ایک ضروری عنصر سے خالی ہے،

(۲) سائنس کے لئے غیر معمولی مصارف، غیر معمولی ساز و سامان اور غیر معمولی آلات کی ضرورت ہے، اور عشق کے لئے ان چیزوں کی ضرورت نہیں، بلکہ وہ بے سر و سامانی کے ساتھ بھی دنیا کو تہ و بالا کر سکتا ہے، جیسا کہ اولوالعزم پیغمبروں نے کیا ہے،

(۳) ڈاکٹر صاحب نے جس عشق کو عقل کا حریف مقابل قرار دیا ہے، وہ عملی قوت ہونے کے ساتھ ایک تخلیقی قوت بھی ہے، اس لئے ان کا نظریۂ عشق مولانا روم کے نظریۂ عشق سے مختلف اور زیادہ ترقی یافتہ ہے، خلیفہ عبد الحکیم لکھتے ہیں،

"رومی کا جذبۂ عشق بہت حد تک محویت ذاتِ الٰہی کے تاثرات میں رہ جاتا ہے، اقبال کے یہاں جذبۂ عشق ایک جذبۂ تخلیق، جذبۂ تسخیر، اور جذبۂ ارتقا بن گیا ہے؛ اور اسی پہلو سے

اقبال نے ایسے مضامین پیدا کئے ہین، جن کا مرشد کے یہان مشکل سے کوئی نشان ملے گا[۱]،

اور اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ مولانا روم کے سامنے اشراقی حکماء کا نظریۂ عشق تھا، جو محویت ذات الٰہی تک محدود تھا لیکن ڈاکٹر صاحب نے عشق کا جو اعلیٰ ترین نمونہ اپنے سامنے رکھا ہے، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عشق ہے، اور اس عشق کا ظہور غار حرا کی خلوت نشینی سے ہوا اس لئے عشق خلوت کی چیز ہے اور عشق کی یہی امتیازی خصوصیت ہے، جو اس کو عقل سے ممتاز کر دیتی ہے، فلسفہ و سائنس کتنی ہی ترقی کر جائین لیکن اُن کی تگ و دو صرف انسان کی بیرونی دنیا تک محدود ہے، اور وہ صرف مظاہر فطرت کی ایک ایک چیز کو لے کر اس کے اوصاف و خواص بیان کرتے ہین، مثلاً پانی مین کیا خاصیت ہے؟ حرارت کے کتنے درجے ہین؟ بھاپ مین کس قدر طاقت ہے؟ اس لئے ان کا میلان صرف جلوت کی طرف ہوتا ہے، اور وہ ان اوصاف و خواص کے انکشاف سے صرف انسان کی بیرونی دنیا مین حرکت پیدا کر سکتے ہین لیکن عشق خارجی دنیا سے کوئی تعلق نہین رکھتا، بلکہ وہ صرف انسان کے روحانی اوصاف و خواص کی جستجو مین رہتا ہے، اس لئے وہ خلوت سے باہر قدم نہین نکالتا، اور اس طرح عقل و عشق کی ترقی کے میدان الگ الگ ہو جاتے ہین،

عقل او را سوے جلوت می کشد

عشق او را سوے خلوت می کشد

اس لئے عقل سے اگرچہ خارجی دنیا کی تمام چیزون کے اوصاف و خواص نمایان ہو جاتے ہین لیکن خود انسان کے روحانی اوصاف و خواص پر پردہ پڑا رہتا ہے، عقل کلی کے چراغ جلا کر تمام دنیا کو تو روشن کر سکتی ہے لیکن اس چراغ کی روشنی انسان کی روحانی زندگی تک نہین پہونچ سکتی، اور اس کو صرف عشق ہی روشن کر سکتا ہے،

---

[۱] رسالہ اردو اقبال نمبر صفحہ،

جلوت او روشن از نور صفات   خلوت او مستنیر از نور ذات

حالانکہ انسان کی حقیقی زندگی یہ نہین ہے کہ وہ بیرونی چیزون کے اوصاف و خواص سے تو واقف ہو اور خود اس کے اندرونی اوصاف و خواص پر پردہ پڑا رہے، بلکہ اس کی اصلی زندگی یہ ہے، کہ خود اس کو اپنی ذات کے اوصاف و خواص بے پردہ ہو کر نظر آئین،

برمقام خود رسیدن زندگی است   ذات را بے پردہ دیدن زندگی است

مرد مومن در نسازد با صفات   مصطفیٰ راضی نہ شد الا بذات

جلوت و خلوت کی اس تفریق نے اگرچہ عقل و عشق کے حدود الگ الگ کر دیئے لیکن صوفیہ کے نظریۂ عشق اور ڈاکٹر صاحب کے نظریۂ عشق کے درمیان حد فاصل قائم نہین ہوئی، کیونکہ ڈاکٹر صاحب کی طرح ہمارے صوفیہ بھی عشق کو خلوت ہی کی چیز سمجھتے ہین لیکن اُن کے نزدیک اس خلوت نشینی کا مقصد محویت و استغراق اور مشاہدۂ ذات الٰہی ہے، اور ڈاکٹر صاحب بھی اس کو ایک اعلیٰ درجہ کا مقصد سمجھتے ہین لیکن ان کے نزدیک اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے سب سے پہلے انسان کو خود اپنی ذات یعنی اپنی خودی کا مشاہدہ کرنا چاہئے، اوپر کے اشعار مین انھون نے جہان جہان ذات کا لفظ استعمال کیا ہے، اس سے خود اپنی ذات یعنی خودی مراد ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غار حرا مین جو خلوت نشینی اختیار کی تھی، اس کا مقصد ڈاکٹر صاحب کے نزدیک صرف یہ تھا، کہ خود اپنی ذات یعنی خودی کے مشاہدہ کو ذات الٰہی کے مشاہدہ کا ذریعہ بنائین، ڈاکٹر صاحب نے اپنے اس مشہور قطعہ:-

ز من گو صوفیان با صفا را   خدا جویان معنی آشنا را

غلام ہمت آن خود پرستم   کہ از نور خودی بیند خدا را

مین جس خود پرست کی غلامی پر فخر کیا ہے اس سے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مراد ہے لیکن اگر

خلوت نشینی مین خودی کو فنا کر دیا جائے، اور صرف ذاتِ الٰہی کا مشاہدہ مقصود ہو تو اس صورت مین عشق محض ایک تحقیقی چیز ہو کر خلوت سے جلوت مین آجاتا ہے، اور اس مین اور عقل مین کوئی فرق باقی نہین رہ جاتا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خود خدا کی ذات کو بے پردہ دیکھنا چاہا، اور اگر وہ ان کو بے پردہ نظر آجاتی تو اس سے صرف ان کی عقل کی تحقیقی قوت کو تشفی ہو جاتی، لیکن خود اُن کی ذات یعنی خودی کی اندرونی صلاحیتون اور قابلیتون پر پردہ پڑا رہجاتا،

گدائے جلوہ رفتی بر سرِ طور   کہ جانِ تو ز خود نامحرمے ہست
قدم در جستجوے آدمے زن   خدا ہم در تلاشِ آدمے ہست

لیکن اگر خلوت نشینی مین خود اپنی ذات یعنی خودی کا مشاہدہ کیا جائے تو انسان کو اپنی اندرونی قابلیتون اور صلاحیتون کا علم ہو جاتا ہے، اور اس صورت مین عشق عقل کی طرح صرف تحقیقی قوت نہین رہ جاتا، بلکہ ایک تخلیقی جذبہ بن جاتا ہے، اور انسان کو یہ معلوم ہو جاتا ہے، کہ وہ اپنی روحانی طاقت سے کام لیکر ایک نئی دنیا پیدا کر سکتا ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غارِ حرا مین خلوت نشین ہو کر خود اپنی ذات یعنی اپنی خودی کی تخلیقی قوتون کا مشاہدہ کیا، جس سے مسلمانون کی ایک نئی قوم پیدا ہوئی،

مصطفیٰ اندر حرا خلوت گزید   مدتے جز خویشتن کس را ندید
نقش ما را در دلِ او ریختند   ملتے از خلوتش انگیختند
گرچہ داری جانِ روشن چون کلیم   ہست افکارِ تو بے خلوت عقیم
از کم آمیزی تخیل زندہ تر   زندہ تر، جوئندہ تر، یابندہ تر
علم و ہم شوق از مقاماتِ حیات   ہر دو می گیرد نصیب از واردات
علم از تحقیق لذت می برد   عشق از تخلیق لذت می برد
صاحبِ تحقیق را جلوت عزیز   صاحبِ تخلیق را خلوت عزیز

چشمِ موسیٰ خواست دیدارِ وجود   این ہمہ از لذتِ تحقیق بود

اب صرف یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے غارِ حرا مین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خلوت نشینی کا جو مقصد بتایا ہے، وہ اسلامی روایات کے مطابق ہے یا نہین؟ جہان تک روایات کا تعلق ہے، غارِ حرا کی خلوت نشینی کے اعمال واشغال اور مقاصد واغراض کا کچھ پتہ نہین چلتا، شراحِ حدیث نے قیاسی طور پر بہت سی وجہین بتائی ہین، لیکن یہ محض ان کی قیاس آفرینیان ہین، کسی روایت سے ان کی تائید نہین ہوتی، بعینہٖ اسی طور پر ڈاکٹر صاحب نے اس کا مقصد ذات یعنی خودی کے مشاہدہ کو قرار دیا ہے اگرچہ یہ بھی ایک قیاسی چیز ہے، تاہم کسی روایت کے مخالف بھی نہین ہے، اور یہ تو یقینی ہے کہ اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد صورِ غیبیہ کا مشاہدہ نہ تھا، ورنہ حضرت جبریلؑ کے مشاہدہ سے آپ کے دل مین اضطراب نہ پیدا ہوتا، بلکہ آپ کو اُس سے تسکین ہوتی، بہر حال عالمِ غیب کی صورتون کا مشاہدہ محققینِ صوفیہ کے نزدیک بھی روحِ انسانی کا کوئی بہت بڑا کمال نہین ہے مجدد الف ثانی کے نزدیک یہ تو بچون کے کھلونے ہین، اصلی چیز خود روح کا تصفیہ وتزکیہ ہے، اور وہ خود روح یا خودی کے مشاہدے سے حاصل ہو سکتا ہے،

(باقی)

اعلان

یکم جنوری ۴۷ء سے مستقل تاجرون کے لئے کمیشن بجائے پندرہ فی صدی اور دوسری مطبوعات پر بیس فی صدی کر دیا گیا ہے، اب اس کے متعلق خط وکتابت بے سود ہو گی

"منیجر"

اسلامی نظریۂ اجتماع

از

جناب مولوی حیدر زمان صاحب صدیقی پٹھان کوٹ

(۲)

اسلامی نظامِ اجتماع کے اختلال کا تاریخی پسِ منظر

زمانہ رسالت سے لیکر خلافتِ راشدہ کے آخری دور تک اسلام کا مقابلہ جاہلیت محضہ کے ساتھ تھا، یہ جاہلیت اگرچہ بڑی سخت جان تھی، مگر اسلام کی نظریاتی اور عملی قوت کے مقابلہ مین اسے ہر قدم پر شکست کھانی پڑی، دنیا کے جس حصہ مین بھی اسلام سے متصادم ہوئی، اس کے پاؤن اکھڑ گئے، اور بالآخر مقہور و مجبور ہو کر رہ گئی، مگر اس حقیقت سے انکار نہین کیا جاسکتا، کہ جو چیز ایک دفعہ کتم عدم سے منظر وجود پر آگئی، وہ دنیا سے کبھی بالکلیہ فنا نہین ہو سکتی، کیونکہ اس عالم رنگ و بو مین ہر نوع کی چیز سما سکتی ہے، اور متخالف و متضاد حقائق و امور کے لئے اس نے کبھی تنگی داماں کا عذر پیش نہین کیا، بالخصوص ہر ایسی چیز جو انسانی طبائع کی مرغوب اور ہوائے نفس سے کچھ مناسبت رکھتی ہو، اس سے انسان کا دامن بچانا مشکل ہو جاتا ہے، یہ دوسری بات ہے، کہ وہ کس وقت اپنی ظاہری ہئیت و لباس کو بدل دے، اور کسی دوسرے لباس مین دنیا کے سامنے آجائے، مگر لباس کی تبدیلی سے حقیقت نہین بدل جایا کرتی، چنانچہ جاہلیت خالصہ جب ہر معرکۂ جنگ مین شکست کھا چکی، یہان تک کہ اس کا سیاسی اور اجتماعی وجود ختم ہو کر رہ گیا، تو اُس نے اپنی بقا کے لئے اسلام کے دامن مین پناہ لینی چاہی، اب وہ شخصیتین اٹھ چکی تھین، جو اسلام کے حصن حصین کے لئے

بابِ مغلق کا کام دے رہی تھین، اور ان کی موجودگی مین باہر کی کوئی چیز اس قلعہ کے اندر گھسنے کی جرأت نہین کر سکتی تھی،

اِنَّ بَینَكَ وَبَینَهُمَا بَاباً مُغلَقاً (بخاری)	تمھارے اور اس کے درمیان ایک بند دروازہ ہے،

مگر جونہی یہ بابِ مغلق سامنے سے ہٹا تو جاہلیت نے اندر گھسنے کے کئی راستے بنا لئے، اب کیا تھا، رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق فتنون کی موسلا دھار بارش شروع ہو گئی،

انی لاری الفتن تقع فی بیوتکم کوقع المطر (بخاری)	مین تمھارے گھرون مین بارش کی طرح فتنون کو برستا دیکھ رہا ہون،

مگر پھر بھی جاہلیت کے لئے یہ ممکن نہ تھا، کہ اپنے پہلے لباس مین اسلام کے سامنے آتی، چنانچہ اب اُس نے نیا چولا بدلا، اور اسلام سے ساز باز کرنی شروع کر دی، کچھ دیا، اور کچھ لیا، اور بالآخر وہ اسلام سے جوڑ توڑ کرنے مین کامیاب ہو گئی، اب وہ بظاہر دیکھنے والون کو مسلمان نظر آتی تھی، مگر باطن مین اسی طرح لات و منات کی چہیتی تھی!

بدل کے بھیس زمانے مین پھر سے آتے ہین
اگرچہ پیر ہے آدم جوان ہین لات و منات

تاریخِ اسلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سلسلہ دولت بنی اُمیہ کے آغاز سے آج تک برابر جاری رہا، مگر یہ جاہلیت کم بخت اتنی زمانہ شناس واقع ہوئی ہے، کہ تاریخ کے ہر دور مین احوال و ظروف کے قالب مین ڈھلنے کی اسے پوری مہارت حاصل ہے، اس کے سامنے تو صرف ایک ہی مقصد رہا ہے، کہ اسلام کے نظامِ اجتماع مین کس طرح اختلال پیدا کیا جاسکتا ہے؟ کس راستہ سے اس پر حملہ و ہجوم ہو سکتا ہے، اور کس لباس مین اُسے اپنی جانب مائل کیا جاسکتا ہے، زمانہ کی رفتار کے ساتھ ساتھ اس کے طرز و طریق بھی بدلتے رہے، خلافتِ راشدہ کے انقطاع کے بعد سب سے پہلے اُس نے ملوکیت و استبداد کا لباس زیب تن کیا کہ اس کے بغیر

کسی طرح اس کا اثر و نفوذ نہین بڑھ سکتا تھا، اور ملوکیت ہی وہ چیز ہے کہ ہر زمانہ مین جاہلیت کی پشت پناہی کرتی رہی ہے، پس ملوکیت کے قیام کے ساتھ اُس نے نقشۂ زندگی کے ایک ایک خانہ پر اپنا رنگ جمانا شروع کیا، اور نظریۂ حکومت مین تبدیلی رونما ہونے کے ساتھ ہی اجتماع و تمدن کے تمام شعبون مین انقلاب معکوس شروع ہوگیا،

خلافتِ راشدہ کا عہد مقدس عہدِ رسالت سے مناسبتِ تامہ رکھتا تھا، اور اس کا نظام فکر و عمل بالکل طریقِ سُنت اور منہاجِ نبوت پر قائم تھا یہی وجہ ہے کہ سرورِ دوجہان صلی اللہ علیہ وسلم نے خلفاے راشدینؓ کے عمل و کردار کو لفظِ سُنت سے تعبیر کیا ہے،

عن العرباض ابن ساریہ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فعلیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین المھدیین تمسکوا بھا وعضوا علیھا بالنواجذ،......

میری سنت اور ہدایت یافتہ خلفاے راشدین کی سُنت کو لازم پکڑو، اس کے ساتھ تمسک کرو اور نہایت مضبوطی سے اسے پکڑ لو، (اخرجہ ابوداؤد و ترمذی)

عن زید ابن ارقم قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انی تارک فیکم ما ان تمسکتم بہ لن تضلوا بعدی احدھما اعظم من الاخر وھو کتاب اللہ حبل ممدود من السماء الی الارض و عترتی اھل بیتی لن یفترقا حتی یردا علیّ الحوض فانظروا کیف تخلفونی فیھما (اخرجہ الترمذی)

مین وہ چیز تم مین چھوڑ کے جا رہا ہون کہ اگر تم اس سے تمسک کروگے تو میرے بعد گمراہ نہ ہوسکوگے، (اس چیز کے دو حصے ہین) ایک ان مین سے دوسری کی نسبت بڑا ہے، وہ اللہ کی کتاب ہے جو آسمان سے زمین تک لٹکی ہوئی رسی ہے اور دوسرا میری اولاد یعنی اہل بیت ہین یہ دونون ایک دوسرے سے ہرگز جدا نہ ہون گے یہان تک کہ قیامت کو میرے پاس حوض کوثر کے مقام پر وارد [illegible]

[illegible]

یہ دونون روایتین بظاہر الگ الگ مفہوم رکھتی ہین، مگر دراصل ان کا مفہوم ایک ہی ہے، احادیثِ نبوی مین جہان خلفاے راشدینؓ کا ذکر آیا ہے، ان مین اہل بیت بھی شامل ہین، اور جہان عترت یا اہلِ بیت کا ذکر ہوا ہے، اس مین خلفاے راشدینؓ بھی داخل ہین، چنانچہ علامہ ابن تیمیہؒ نے بھی اس کی تصریح کی ہے، گویا عترت اور اہل بیت سے مراد رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانی اولاد ہے، جو صحیح طور پر اپنے روحانی باپ کے نقشِ قدم پر چلنے والی ہے، لیکن میرے خیال مین یہ دونون حدیثین اپنے منشا و مصداق کے اعتبار سے بعد مین آنے والے مجددینِ ملت اور مصلحینِ اُمت پر بھی حاوی ہین، کیونکہ ان کا مسلک و طریق بھی خلفاء و اہلِ بیت کے مسلک کے عین مطابق ہے، اور یہ مقدس ہستیان گویا خلفاء الخلفاء ہین، لہذا اولاً و بالذات نہ سہی، مگر بالتبع یہ بھی ان احادیث مین شامل ہین،

غرض خلفاے راشدینؓ کا وہ مقدس دور دینی اخلاقی، سیاسی اور اجتماعی نقطۂ نظر سے بالکل عہدِ نبوت سے مشابہ تھا، صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین، صورت و سیرت، اخلاق و معاشرت اور عمل و کردار مین رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے زندہ نمونہ تھے، اور وہ جہان گئے وہان کے لوگون کو اپنے ہی رنگ مین رنگ دیا، ان کا کردار اور کیرکٹر دوسرون پر اثر انداز ہوتا تھا، مگر وہ خود کسی سے متاثر نہ ہوتے تھے، اور انہی نے دنیا کے انسانون کو صحیح اسلامی فکر و عمل اور سیاست و اجتماع سے روشناس کیا، مگر خلافت راشدہ کے انقطاع کے بعد زمام سیادت بنی امیہ کے ہاتھ آگئی، اور اسی وقت سے اسلامی طرز سیاست اور حریت اجتماع مین ایک ناخوشگوار انقلاب رونما ہوا، اب خالص اسلامی جمہوریت کے بعد ملوکیت و استبداد کا دور شروع ہوا، اور اس ظالمانہ طرزِ سیاست نے اجتماعِ اسلامی کی جڑین کھوکھلی کر دین، اگرچہ اس عہد مین صحابۂ کرام کی ایک بڑی تعداد موجود تھی، مگر بقول سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ الملک و الدین توامان " یعنی دین کا قیام حکومت کے بغیر ممکن نہین، چونکہ قوتِ مقتدرہ جن کے ہاتھون مین منتقل ہوگئی تھی وہ

انتہائی درجہ کے عیاش، بدکردار اور ظالم تھے، اور ظاہر ہے کہ انسانون کے اخلاق و معاشرت اور اجتماع و تمدن پر سب سے زیادہ ملکی سیاست ہی اثر انداز ہوتی ہے، اس لئے صحابۂ کرامؓ کی مجاہدانہ جد و جہد بھی اس سیلاب کو نہ روک سکی،

دورِ خلافتِ راشدہ مین آزادی فکر و رائے، حریتِ اجتماع اور مساواتِ عامہ کو جس قدر اہمیت حاصل تھی، اس سے اسلام کا کوئی بڑے سے بڑا مخالف بھی جرأت انکار نہین کر سکتا، جس کی تفصیل مین "اسلامی نظریۂ سیاست" مین کر چکا ہون، مگر دورِ بنی اُمیہ کے آغاز ہی مین طبقاتی نظامِ اجتماع اور ظالمانہ تمدن کی بنیاد پڑ گئی، وہی جاگیردارانہ سسٹم، شریف و وضیع کے امتیازات اور امیر و غریب کی تفریق جو اسلام کے دورِ اول مین ختم کر دی گئی تھی، دوبارہ مسلمانون کے طرزِ اجتماع مین داخل ہو گئی، افکار و عقائد مین فساد رونما ہونے لگا، اسلامی دستورِ اخلاق کو بدل دیا گیا، تعلیم و تربیت کے طرز و طریق مین تجدد کا سلسلہ جاری ہوا، شراب نوشی، بدمستی، عیش کوشی، جبر و تشدد اور تمام ملوکانہ صفات بروئے کار آنے لگین،

مگر تاریخِ اسلام کی یہ ایک درخشندہ حقیقت ہے، کہ وہ پرستارانِ ملوکیت اور داعیانِ تجدد و تلبیس کے ساتھ ساتھ مردانِ راہِ حق، داعیانِ حریت و آزادی، مجددینِ ملت اور مصلحینِ امت کی شاندار روایات بھی پیش کر رہی ہے، اگر ایک طرف خود مسلمانون سے ہی کوئی جابر و قاہر اور مختارِ مطلق حکمران پیدا ہوتا ہے، جو اپنے ظالمانہ کردار اور تجدد پسندی سے جاہلی افکار و اعمال کا احیاء کرتا ہے، اور دینِ خداوندی کو ہوائے نفس کے تحت چلانا چاہتا ہے یا فرقِ باطلہ کے فاسد عقائد، اسلامی اور قرآنی طریقِ اجتماع و سیاست مین تزلزل رونما ہونے لگتا ہے، تو ساتھ ہی ایک پُراسرار قوتِ روحانی کا حامل مردِ مجاہد بھی اٹھ کھڑا ہوتا ہے، جو اپنی بے پناہ قوتِ عمل سے پرستارانِ باطل کے تمام منصوبون کو پاش پاش کر دیتا ہے، اور دینِ خداوندی کو سالہا سال کی آمیزشون سے پاک کر کے تجدیدِ ملت اور احیاءِ دین کے کٹھن مراحل کو ایک محدود عرصہ ہی مین طے کر جاتا ہے،

دگر قومے کہ ذکر لا الہ اش — برآرد از دل شب صبح گاہش
شناسد منزلش را آفتابے — کہ ریگِ کہکشان روبد ز راہش

یہ ہے وہ حقیقتِ باہرہ جو اسلامی تاریخ کے ہر دور مین آپ کو نمایان نظر آئے گی، اور کیون نہ ہو کہ خود سید الاولین والآخرین صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حقیقتِ کبریٰ کو ان الفاظ مین ظاہر فرما دیا تھا،

ان اللہ یبعث لہذہ الامۃ علی	اللہ تعالیٰ اس امت کے لئے ہر سو سال
راس کل مائۃ سنۃ من یجدد لہا	کے خاتمہ پر کوئی ایسی جامع شخصیت
دینہا،	بھیجے گا، جو اس امت کے دین کی
(اخرجہ ابو داؤد والحاکم والطبرانی)	تجدید کرے گی،

یہ بحث اگرچہ ایک مستقل موضوع رکھتی ہے، اور اس کے تفصیلی گوشے ہمارے موضوع سے غیر متعلق ہین، مگر اجتماعِ اسلامی کے فساد و اختلال کے تاریخی پس منظر کا ذکر کرتے ہوئے علی وجہ التبعیت اس کا ذکر بھی آجانا لازمی ہے،

قریباً نصف صدی کے اس دورِ ضلالت و ملوکیت کے بعد خدائے قدوس نے بنی امیہ ہی سے ایک جلیل القدر شخصیت حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کو مجددیت کے منصب پر فائز فرمایا، آپ نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ وراثت و جانشینی کے اُس جاہلی تصور کو مٹایا، اور مجمعِ عام مین اعلان فرمایا،

ایہا الناس انی ابتلیت بہذا الامر	اے لوگو مجھے میری رائے اور خواہش نیز عام
من غیر رای منی ولا طلبۃ لہ	مسلمانون کے مشورہ کے بغیر ہی حاکم بنا دیا
ولا مشورۃ من المسلمین وانی	گیا ہے، اور اب مین اپنی بیعت سے تمہین آزاد
خلعت ما فی اعناقکم من بیعتی	کرتا ہون، اور میرے سوا جس کو چاہو
فاختاروا لانفسکم غیری	اپنا امیر بنا لو،

چنانچہ اسلامی طریقِ انتخاب سے اُن ہی کو خلیفہ چنا گیا، اور اس طرح ملوکیت کا بُت اُن کے ہاتھون سے چور چور ہو کر رہ گیا،

اس کے بعد تجدیدِ دین اور احیاءِ ملت کا کام شروع کیا، کتاب و سُنت کے علوم کی طرف خاص توجہ دی گئی، اسی زمانہ سے احادیث کی ترتیب و تدوین کی مہم شروع ہوئی، ثقافت و تہذیبِ اسلامی کو غیر اسلامی آمیزشون سے پاک کیا گیا، نظامِ تعلیم و تربیت اور فکرِ عامہ مین از سرِ نو اسلامی طرز کا انقلاب رونما ہونے لگا، اور تمدن کے تمام شعبون کی کتاب و سُنت کے مطابق تشکیل ہونے لگی، یہان تک کہ جاگیردارانہ نظام کا قلع قمع کر دیا گیا، شاہی خاندان مین جس قدر جاگیرین تھین، وہ بیت المال کی ملکیت قرار دی گئین، شاہ و گدا، امیر و غریب اور دیگر نسلی، وطنی اور قومی امتیازات کو مٹا کر از سرِ نو مساواتِ عامہ، حریتِ اجتماع اور آزادیٔ فکر کو رواج دیا گیا، مگر افسوس ہے کہ یہ کام ابھی تشنۂ تکمیل ہی تھا، کہ عمرِ ثانی رض کی عمر نے وفا نہ کی، اور آپ رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے،

اب مجددِ اوّل کی وفات کے بعد مستقل طور پر عنانِ اقتدار جاہلیت کے ہاتھون مین چلی گئی، اور پھر آج تک دنیا کے کسی حصہ مین کوئی پائدار اسلامی طرز کی حکومت قائم نہ ہو سکی، چونکہ مذہب اور اقتدار دونون قوتین لازم و ملزوم ہین، اس لئے تاوقتیکہ یہ دونون یک تخت کسی جامع شخصیت کے ذریعہ عمل پذیر نہ ہون، دنیا مین امن و نظم کا قیام دشوار ہی نہین، بلکہ ناممکن ہے،

این دو قوت حافظِ یک دیگر اند
کائناتِ زندگی را محور اند (اقبال)

مگر اب اقتدار نے مذہب سے پیچھا چھڑا لیا، اور جاہلیت کے راستہ مین اب کوئی رکاوٹ نہ رہی، چنانچہ اب اس نے اس موقع کو غنیمت جان کر مختلف راستون سے ملتِ اسلامیہ پر یلغار شروع کر دی، ہر نئے دور مین ایک نیا روپ بدل کر سامنے آئی، اور جسدِ ملی مین اس کا اثر و نفوذ بڑھتا ہی چلا گیا، مگر

حضرت مجددِ اوّل نے اپنے ڈھائی سالہ دورِ خلافت مین فکرِ اسلامی کو جس سطح پر لا کھڑا کیا تھا، اُس کے دور رس نتائج کو روک دینا کسی کے بس کی بات نہ تھی، اب ایک طرف جاہلیت کی قوتین مصروفِ کار تھین، اور دوسری طرف مجددِ اوّل کی نہضتِ علمی اور حرکتِ دینی اپنا رنگ دکھا رہی تھی،

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی (اقبالؒ)

بنی امیہ کا دورِ استبداد ۱۳۲ھ تک قائم رہا، اس عہد مین بہت سی اسلامی شخصیتین پیدا ہوئین، جن مین حضرت امام ابو حنیفہ (پیدایش ۸۰ھ وفات ۱۵۰ھ) اور حضرت امام مالکؒ (پیدایش ۹۳ھ وفات ۱۷۹ھ) فکر و اجتہاد اور تبحرِ علمی کے اعتبار سے ممتاز درجہ رکھتے ہین، مگر مصیبت یہ تھی کہ سلاطین و امراء کے فکر و ذہن کو جاہلیت نے اس قدر ماؤف بنا دیا تھا، کہ اب وہ فکرِ اسلامی سے بالکل تہی دست ہو چکے تھے، اور کتاب و سنت کی اصل روح کو ہوائے نفس کے تہ در تہ پردون مین چھپا رکھا تھا، اب اگر کوئی مردِ خدا ان پردون کو ہٹا کر روحِ اسلامی کو بے نقاب کرنا چاہتا، تو ملوکیت کی تمام طاقتین اُس کے خلاف صف آرا ہو جاتین، حقیقت یہی ہے کہ اُس وقت سے لے کر اس وقت تک جاہلیت کے جتنے کارنامے ہین ان مین یہ رنگ زیادہ نمایان رہا ہے، امراء کو کچھ ایسے علماءِ سو مل جاتے تھے، جو بندگانِ حرص و آز اور پرستارانِ سیم و زر تھے، اور ان کی زبان سے اہلِ حق پر کفر کے فتوے لگوائے جاتے تھے، اور پھر ان کو قید و بند مین ڈالا جاتا، کوڑون سے پیٹا جاتا، قتل کی دھمکیان دی جاتین، غرض وہ سب کچھ ہوتا رہا، جو اہلِ حق کو اعلاءِ کلمۃ الحق کے صلہ مین اربابِ جور کی طرف سے بطور انعام مل سکتا ہے، مگر ان مردانِ خدا نے اس راہ مین خوف و طمع کی تمام زنجیرون کو پاش پاش کر کے رکھدیا، قید و بند کی صعوبتین اور کوڑون کی بارش بھی اُن کے عزم و استقلال مین تزلزل پیدا نہ کر سکی،

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند این عاشقانِ پاک طینت را

اور دولت و ثروت، جاہ و عزت کے مژدے بھی سنائے گئے، مگران مردانِ راہِ حق کو کوئی چیز جادۂ مستقیم سے نہ پھیر سکی،

یہ دونون جلیل القدر امام بنوامیہ کے عہد مین پیدا ہوئے، اور عہدِ عباسی مین اُن کی وفات ہوئی یہی وہ مقدس نفوس تھے، جن کی جبینِ رسا اور نظرِ حق شناس نے قرآن وحدیث کے غوامض واسرار کو آشکارا اور فکر واجتہاد اور اخذ واستنباط کے ذریعہ احکام وشرائعِ قوانینِ سیاست، اور نظامِ اجتماع وتمدن کو مرتب کیا،

یہ دونون اصحابِ عملی سیاسیات اور اربابِ سیاست سے الگ تھلگ رہے، اور ان کی علمی کاوشین کسی امیر وسلطان کی رہینِ منت نہ ہوئین، بلکہ اُن کی طبعِ غیور نے انھین سلاطین کی منت پذیری سے ہمیشہ بے نیاز رکھا، کئی سلطنتین بنین اور بگڑین، کئی انقلاب آئے، سلاطین کی باہم رقابتون نے خدا کی زمین کو تہ وبالا کر دیا، مگر یہ مردانِ حق شناس اپنے مقام وموقف پر قائم رہے،

جہانتک ملکی سیاسیات کا تعلق ہے ان دونون حضرات کے متعلق صرف اتنا ہی معلوم ہوسکا ہی کہ مدینہ منورہ مین جب حضرت امام حسنؑ کے پڑپوتے، محمد مہدی نے خلافت کا دعویٰ کیا، تو منصور عباسی کی ایک بہت بڑی فوج نے مدینہ پر چڑھائی کر دی، محمد مہدی کے پاس تھوڑی سی فوج تھی، جب انھون نے دیکھا کہ کامیابی کی کوئی امید نہین تو انھون نے اپنے لشکریون سے فرمایا، کہ جو لوگ اپنی جان بچانا چاہتے ہین، وہ اپنے گھرون مین چلے جائین، اب صرف تین سو تنہا ہوا رہ گئے، مگر خاندانِ سادات کے چشم و چراغ محمد مہدیؒ کی تنہا تلوار نے ایک سو بہادرون کو موت کے گھاٹ اتار دیا مگر آخر شکست کھائی، اس لڑائی مین امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ نے محمد مہدی کا ساتھ دیا تھا جس کے نتیجہ کے طور پر ان حضرات کو سخت سزائین دی گئین، امام ابوحنیفہؒ کو جیل مین ڈالا گیا، اور اسی حالت مین زہر دلایا گیا، اور امام مالکؒ کے کوڑے لگائے گئے، اور اُن کی مشکین کسی گئین، یہانتک کہ بازو بھی ٹوٹ گیا،

غرض ۱۳۲ھ سے عباسیون کا دورِ امامت شروع ہوا، اور بدقسمتی سے یہ لوگ اس معاملہ مین

امرائے بنی امیہ سے بھی دو قدم آگے بڑھ گئے، چنانچہ اس دور مین جاہلیت نے یکبخت کئی روپ دھارلئے، امرا نشۂ اقتدار مین بدمست تھے، لادینی اور لامذہبیت کا ایک متلاطم خیز سمندر امنڈ کر آگیا، اور اسلامی نظام فکر وعمل پر ہر طرف سے یورش ہونے لگی،

خاندانِ سادات کے چھٹے امام حضرت امام جعفر صادقؒ تک شیعہ فرقہ مین اتحاد رہا، مگر اُن کے بعد یہ فرقہ دو گروہون مین تقسیم ہوگیا، ایک بڑا گروہ حضرت موصوف کے بڑے بیٹے حضرت امام کاظم کو امام ماننے لگا، اور کچھ لوگ اُن کے دوسرے بڑے بیٹے اسمٰعیل کو امامت کا حقدار تسلیم کرنے لگے، ثانی الذکر گروہ اسماعیلی فرقہ کے نام سے موسوم ہوا، اور یہ گروہ بھی آگے چل کر دو گروہون مین منقسم ہوگیا، ایک گروہ وہ تھا جو اپنے عقائد لوگون سے چھپاتا تھا، اور اندرونی طور پر اپنے خیالات وافکار کی تبلیغ واشاعت مین مصروف تھا، یہ گروہ باطنی فرقہ کے نام سے مشہور تھا، اس گروہ نے سارے ملک مین تبلیغ کا وسیع جال پھیلا رکھا تھا، اور دوسرا گروہ جو قرمطی کہلاتا تھا، وہ اگرچہ اتنا منظم نہ تھا، مگر اس کے ماننے والے بڑے دلیر اور بہادر تھے، علم کلام مین ان فرقون کے عقائد پر مفصل بحث کی گئی ہے، ان کا مذہب دراصل اسلام اور مجوسیت سے مرکب تھا، کیونکہ یہ لوگ ایرانی الاصل تھے، اس لئے ایران کے قدیم مذہب اور تہذیب وتمدن کا ان کے خیالات پر گہرا اثر تھا،

باطنی فرقہ کا بانی ایک شخص عبد اللہ بن میمون قداح نامی تھا، اُس نے بیت المقدس مین اپنی تبلیغ کا وسیع سلسلہ شروع کر رکھا تھا، اور اپنے آدمی جگہ جگہ بٹھائے ہوئے تھے، جو کبوترون کے ذریعہ اس کو خبرین پہنچاتے تھے، اس بنا پر لوگ اس کے معتقد ہوگئے تھے،

ان فرقون کے علاوہ فرقۂ معتزلہ نے بھی اسی دور مین عروج حاصل کیا، یہ لوگ ایک جدید فلسفیانہ مذہب کے موجد تھے، اور انھون نے دینِ خداوندی مین دل کھول کر تحریف کی، یہانتک کہ فکر اسلامی کی پوری عمارت کو متزلزل کر دیا، اور پھر بات یہین تک ختم ہوجاتی، تو کوئی بات نہ تھی، مگر اس سے بھی

بڑھ کر جاہلیت نے ان لوگون پر بھی دست درازی شروع کر دی، جو اہلِ السنت کہلاتے تھے، اور علم وفضل مین یگانۂ روزگار تھے، انھون نے ان نئے فرقون کے دفاع ومقابلہ کے لئے اسی قسم کے جاہلی ہتھیا استعمال کرنے شروع کر دیئے، اور یونانی فلسفہ کے اوہام وخرافات کو افکار اسلامی کے ساتھ مخلوط کر دیا،

چنانچہ اس عہد کی کتب تفسیر اور دیگر اسلامی لٹریچر بھی ان نئے خیالات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا،

مگر اس دورِ جاہلیت مین بھی اللہ کے کچھ مقدس بندے پیدا ہوئے، جنھون نے جاہلیت کے اس بے پناہ ہجوم کا پامردی سے مقابلہ کیا، ان مین امام اجل حضرت احمد بن حنبلؒ امام شافعی اور امام ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل بخاری کے اسماءِ گرامی قابلِ ذکر ہین،

حضرت امام احمد بن حنبل (۱۶۴ھ تا ۲۴۱ھ) جن کا نام زبان پر آتے ہی دل مین عقیدت ومحبت کے جذبات امڈ آتے ہین، ایک بہت بڑے امام حدیث اور مجدد دین تھے، اسلام کے اس بطل جلیل اور علمبردار علوم نبوت کو زندگی کے جن دشوار گذار مراحل سے گذرنا پڑا، ہماری طرح کے کمزور اور نحیف لوگ اس کا تصور بھی مشکل سے ہی کر سکتے ہین، مگر خدا کو جن لوگون سے کام لینا منظور ہوتا ہے، ان کی ذہنی اور جسمانی بناوٹ بھی عام انسانون سے مختلف ہوتی ہے،

حضرت امام نے چار عباسی حکمرانون کا زمانہ دیکھا، اپنے جسم اطہر پر ظلم وتشدد کے پہاڑ گرتے ہوئے بھی دیکھے، اور پھر عقیدت ومحبت کے پھولون کی بارش بھی دیکھی، یہ دونون حالتین اگرچہ صبر آزما تھین، مگر کیا کہنے ان اللہ والون کے کہ کسی حالت مین اپنے دامن بے نیازی کو دنیاوی نجاست سے ملوث نہ ہونے دیا، جن لوگون نے اللہ کے ساتھ اپنی جان کا سودا کر لیا ہے وہ کسی نفع وسود کے متلاشی نہین ہوتے،

دل دادم وجان دادم وایمان دادم
سود است ولے سود نمی دانم چیست

غرض ان چار بادشاہون مین سے مامون، معتصم اور واثق کے زمانہ مین حضرت امام پر شدائد ومظالم

کی انتہا کر دی گئی، انسان تو انسان ہے، پہاڑ بھی ان مصائب کی تاب نہ لا سکین، مگر یہ انسان خمخانۂ احدیت کے رنگ ہی نرالے ہین، اُن کے آہنی عزم کو دنیا کی کوئی طاقت متزلزل نہین کر سکتی، اور وہ اس دنیا کی فانی لذت، حیاتِ دنیوی کی پر فریب چمک دمک، بادشاہی جلال وجبروت اور طلسم زخارف پر لات مار کر اپنے نصب حیات کی تکمیل مین مصروف سعی رہتے ہین، اور درحقیقت یہ بلند ترین مقام ان خوش بخت اور نیک طالع انسانون کو ہی میسر آتا ہے جن پر خدائے قدوس کی خاص نظرِ التفات ہو،

بلند مرتبہ زان خاکِ آستان شدہ ام
غبار کوے توام گر بہ آسمان شدہ ام

امام موصوف کی نسبت خود اُن کے معاصرین نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے، ان سے اس امر کا انکشاف ہوتا ہے، کہ ان کے عزم بلند کے سامنے بادشاہون کا جاہ وجلال دنیا کی ہر چیز سے حقیر تھا، ابراہیم بن مصعب کوتوال کہتے ہین، کہ مین نے بادشاہون کے آگے امام احمد سے زیادہ کسی کو دلیر اور نڈر نہین پایا، اون کے الفاظ ہین :-

يومئذ ما نحن في عينيه الا كامثال الذباب،

ترجمہ: ہم (کار پردازانِ حکومت) ان کی نظر مین ایسے تھے، گویا ان کے سامنے مکھیان بھنک رہی ہون

بشر حافی جو اس زمانہ کے بہت بڑے زاہد وعابد تھے، فرماتے ہین، کہ جب امام احمد کو قید کر کے پابزنجیر طرطوس روانہ کیا گیا، تو ابو بکر الاحول نے سوال کیا، ان عرضت عليك السيف تجيب؟ اگر تم پر تلوار پیش کی جائے تو پھر جواب دوگے ؟ فرمایا، "لا" ہرگز نہین،

بشر حافی سے کہا گیا کہ وہ ان کی سفارش کیون نہین کرتے، تو فرمایا مجھ مین ان مصائب کے تحمل کی قوت نہین، قام احمد مقام الانبياء احمد تو انبیا کے مقام پر کھڑے ہین،

اس مردِ خدا کی بے نیازی کا یہ عالم تھا، کہ حسن بن عبد العزیز نے ہزار ہزار روپیہ کی تین تھیلیان

آپ کی خدمت مین پیش کین، اور عرض کیا یہ مال مجھے ترکہ مین ملا ہے، اور بالکل طیب ہے، آپ اسے قبول فرمائین، تو فرمایا مجھے اس کی ضرورت نہین، میرا مالک مجھے رزق دے رہا ہے،

جب متوکل کا زمانہ آیا، تو صورتِ حال بدل گئی ظلم و تشدد کی جگہ انعام و اکرام کی بارش شروع ہوگئی، تو یہ دیکھ کر بے اختیار چلا اٹھے،

هذا امر اشد علیّ من — یہ عقیدت و محبت کا جال میرے لئے

ذالک " — کوڑون کی مار اور قید سے زیادہ سخت ہے'

حضرت امام شافعی (۱۵۰ھ تا ۲۰۴ھ) بھی بلند پایہ شخصیت کے مالک تھے، فکر و اجتہاد اور فقہ اسلامی کی ترتیب و تدوین مین انھون نے نمایان کام کیا، مگر حکومت وقت نے ان کو بھی نہ چھوڑا اور یمن سے بغداد تک انھین پابزنجیر لایا گیا،

امام بخاری (۱۹۴ھ تا ۲۵۶ھ) کے تفقہ فی الدین اور تبحر علمی سے ساری دنیا روشناس ہے، یہ جلیل القدر امام حدیث جب فراغت علم کے بعد اپنے وطن بخارا تشریف لائے تو حکومت بخارا کی طرف سے ان کا شاہانہ استقبال کیا گیا، مگر چند ہی دن قیام کیا تھا کہ امیر بخارا ان کی بے نیازی و استغنا اور بے باکانہ تبلیغ سے چلا اٹھا، امام بخاری سے مطالبہ کیا کہ آپ شاہی محل مین تشریف لاکر شاہزادون کو درس حدیث دیا کرین، مگر امام صاحب نے جواب دیا کہ ایسا نہین ہوگا، اگر خواہش ہو تو بچون کو میرے پاس بھیج دیا کرو، مگر امیر نے کہا کہ اچھا پھر اتنا تو ضرور کرو کہ جب میرے بچے تعلیم کے لئے آئین تو اوس وقت کسی جولاہے یا موچی کا لڑکا وہان بیٹھنے نہ پائے مین اس بات کو پسند نہین کرتا کہ جہان میرے لڑکے بیٹھے ہون، وہان گھٹیا درجہ کے لوگ بھی ان کے ساتھ بیٹھین، مگر علوم نبوت کا یہ عالم متبحر اور اسلامی نظام حیات کا شارح کیونکر یہ برداشت کرسکتا تھا، کہ ان کے حلقہ درس مین امیر و غریب اور شریف و رذیل سے جدا جدا سلوک ہو، انھون نے صاف جواب دیا کہ علم حدیث وراثت رسول ہے، کسی شاہ و امیر کی جاگیر نہین یہان

تو شاہ و گدا اور امیر و غریب ایک ہی صف مین بیٹھین گے، اس بات پر امیر سخت ناراض ہوگیا، اور علماے سو کے توسط سے آپ پر کفر کے فتوی لگائے گئے، آخر امام صاحب کو اپنے وطن مالوف سے ہجرت کرنی پڑی اور سمرقند کے ایک گاؤن مین پہنچے، جہان انھون نے بعد نمازِ عصر بارگاہِ رب العزت مین بصد عجز و نیاز یہ دعا کی کہ

"اے خدا تیرے اس بندے پر زمین کی وسعتین تنگ آگئی ہین، اب تو اسے اپنے پاس بلالے"

چنانچہ چند دنون ہی مین اس دعا نے اثر دکھایا، اور آپنے اسی گاؤن مین فرشتۂ اجل کو لبیک کہی، انا للہ و انا الیہ راجعون،

غرض عباسیہ کا دورِ حکومت ۱۳۲ھ سے شروع ہو کر ۶۵۶ھ یعنی پورے پانصد سال تک جاری رہا، اور اس کے بعد مصر مین اس خاندان کے کچھ افراد نے ۹۲۳ھ تک حکومت کی، مگر دورِ بنی امیہ کے آغاز مین جس فتنۂ جاہلیت نے سر اٹھایا تھا، وہ دن بدن بڑھتا ہی چلا گیا، اور دوسری طرف سیاسی اعتبار سے بھی مسلمانون کا جاہ و جلال تیسری صدی کے اختتام تک زور دن پر رہا، مگر اس کے بعد باہم سیاسی اختلاف و نزاع کی وجہ سے اسلامی سلطنتون کی حالت ناگفتہ بہ حد تک پہنچ گئی، بیرونی طاقتین بھی سر اٹھانے لگین، خلافت عباسیہ کی شوکت ایک افسانہ بن گئی، ہسپانیہ کی حکومت کا بھی یہی حال تھا، ہندوستان اور دوسرے ممالک مین بھی انتہائی بے چینی پھیلی ہوئی تھی، امرا گتس سے بخارا تک مسلمان ہی مسلمان تھے، مگر ان مین کوئی موثر طاقت نہ تھی، دوسری طرف قرامطہ کا فتنہ زور دن پر تھا، ان حالات مین خداے قدوس نے کچھ مردانِ حق کو پیدا کیا، جنھون نے اصلاحِ ملت اور تجدید دین کا بیڑا اٹھایا، ان مین ایک حضرت محی الدین ہین، جنھون نے چوتھی صدی مین اندرونی اور بیرونی فتنون کے سدباب کے لئے زبردست کوشش کی، تمام دنیا مین اپنے خلفا کو پھیلا دیا، اور ان کی بے لوث کوششون سے پانچوین صدی مین مسلمانون کی قوت و شوکت بھی نصف النہار پر پہنچ گئی، دوسری طرف امام غزالیؒ نے

قلمی جہاد کے ذریعہ فلسفۂ یونان کے بڑھتے ہوئے الحاد اور فرق باطلہ کی فتنہ انگیزیون کا زبردست مقابلہ کیا، اور اپنے مخصوص رنگ مین اسلامی نظریۂ حیات کی شرح کی، اس کا نتیجہ یہ ہوا، کہ دہریت و الحاد کا وہ سیلاب عظیم جو عام مسلمانون کو خس وخاشاک کی طرح بہائے جارہا تھا، رک گیا، اور صحیح اسلامی فلسفۂ حیات کا رنگ اُبھرنے لگا،

اسی طرح امام ابن تیمیہ جو ساتوین صدی کے ایک بہت بڑے بلند پایہ عالم سنت اور فاضل اجل تھے، انھون نے بھی اسی زمانہ کے اعتقادی اوہام وخرافات کا نہایت عزم واستقلال سے مقابلہ کیا، اور اسلام کے عقائد وافکار اور نظام اجتماع وتمدن مین اس وقت تک جس قدر مشرکانہ اثرات پیدا ہوچکے تھے ان کو ایک ایک کرکے نکالا، اور خالص اسلامی نظام فکر وعمل مرتب کیا، اور ان کی فاضلانہ تصانیف نے عالم اسلامی کے اعتقادی ناسور کے لئے نشتر کا کام دیا، مگر انھون نے صرف علمی جہاد ہی پر اکتفا نہین کی، بلکہ اس وقت کی سب سے بڑی قاہرانہ طاقت یعنی تاتاری وحشت کے مقابلہ مین جہاد بالسیف بھی کیا،

لا تنال بغیر السیف نزلۃ

ولا ترد صدور الخیل بالکتب

ہندوستان مین اسلام اور جاہلیت کی ٹکر

اسلام کے دور اول مین عرب تاجرون کے قافلے ہندوستان مین آئے، مالابار اور کالی کٹ کی سرزمین نے سب سے پہلے ان کا خیر مقدم کیا، چونکہ ان لوگون پر اسلامی نظریۂ اجتماع ومدنیت کا گہرا اثر تھا، اس لئے ان کی سادگی، خلوص اور بلند اخلاقی نے ان علاقون کے باشندون کو بھی اپنے رنگ مین رنگ دیا، دیانت وامانت اور عمل وکردار کی عمدگی کی وجہ سے ان کا اثر ونفوذ اس حد تک بڑھا کہ ہندو راجے بھی ان کو عقیدت واحترام کی نظر سے دیکھنے لگے، یہی وجہ ہے، کہ آج تک ان علاقون مین اسلامی تہذیب ومدنیت کا کچھ نہ کچھ اثر پایا جاتا ہے، بنی امیہ کے زمانہ مین محمد ابن قاسم نے سندھ پر حملہ کیا، اور انھون نے ہندو راجاؤن کو شکست دی، مگر بنی امیہ کے نزدیک ان علاقون

کی کوئی زیادہ اہمیت نہ تھی، اس لئے محمد بن قاسم کو واپس بلالیا، ہندوستان مین اسلامی حکومت کا قیام محمد غوری کے غلامون کے ہاتھ سے عمل مین آیا، جن کا پہلا حکمران قطب الدین ایبک سنہ ۱۲۰۶ء مین تخت نشین ہوا، یہ خاندان اصل ونسل کے اعتبار سے ترکی تھا، اس وجہ سے اس مین نسلی شرافت، سادگی اور شجاعت وبسالت تو طبعی تھی، مگر اسلام نے ان مین عدل ورواداری اور کچھ بلند نظری بھی پیدا کردی تھی، اس کے بعد کئی خاندانون نے ہندوستان پر حکومت کی، اور حق یہ ہے کہ دبدبہ وشوکت اور جاہ وجلال کے لحاظ سے ان مین کوئی کمی نہ تھی، البتہ اگر ان مین کوئی کمی تھی، تو وہ یہ کہ اسلام کی اصل روح سے بہت حد تک نابلد تھے، اگرچہ بعض حکمران ایسے بھی ہوئے ہین، جو فطرۃً صالح اور نیک نہاد تھے، مثلاً ناصر الدین محمود اور مغل شہنشاہ عالمگیر وغیرہ، مگر افسوس کہ صحیح اسلامی نظام سیاست واجتماع کے نفاذ واجراء کی ان کو بھی توفیق نصیب نہ ہوئی، اس ملک مین اشاعت اسلام اور تبلیغ دین کی اگر کوئی کوشش ہوئی، تو وہ صرف اولیاء اللہ وعلمائے حق کے ذریعہ سے حضرت معین الدین چشتی پشاور کے راستہ سے آئے، لاہور اور دہلی سے ہوتے ہوئے اجمیر کو اپنا مرکز تبلیغ بنایا، انھون نے اپنے خلفاء کو ملک کے کونے کونے مین بھیج دیا، خواجہ قطب الدین بختیار کو دہلی مین متعین کیا، خواجہ فرید گنج شکر کو پاکپٹن مین اور جلال الدین تبریزی نے بنگال مین اشاعت دین کا سلسلہ جاری کیا، ان حضرات کی تبلیغی جدوجہد سے ہندوستان مین کسی حد تک شعائر اسلامی نے رواج پایا،

جاہلیت کا نیا کارنامہ

ہندوستان کی سرزمین ہر بات مین نرالی واقع ہوئی ہے، جو بات دنیا کے کسی کونے مین دیکھی اور سُنی نہ جاسکتی ہو، اسے ہندوستان مین دیکھا اور سنا جاسکتا ہے، اس سے پہلے بنی امیہ ہون یا شاہان عباسیہ، حکومت مصر ہو یا سلطنت ترکیہ، سب مین ایک امر مشترک ضرور تھا، کہ وہ خالص اسلامی فکر ونظر اور طریق اجتماع وسیاست سے دانستہ یا نادانستہ طور پر مستغنی تھے، اور جاہلی فکر وعمل نے اُن کے دل ودماغ پر گہرا اثر جمالیا تھا، مگر باین ہمہ ان مین ایک قسم کی اسلامیت کا تصور موجود تھا، اور جس کی

بنا صرف اسلام کے بنیادی افکار و اعمال پر تھی، یہ دوسری بات ہے کہ اسلامی فکر و عمل مین بھی ان لوگون نے بہت کچھ ہیر پھیر کر دیا تھا، تاہم برائے نام سہی مگر داعیۂ اتحاد اب تک اسلامی عقائد و اعمال ہی متصور ہوتے تھے، مگر ہندوستان کے شہنشاہ اکبر (دی گریٹ امپرر) نے یہ کسر بھی پوری کر دی، اس کے تصور نے اسلام کے مخصوص نظام اجتماعی کو سخت نقصان پہنچایا، اور جسد ملی کے جوڑ جوڑ کو مضمحل کر دیا، لیکن بمقتضائے (لکل فرعون موسیٰ) خدا نے اسی جنم بھونی مین ایک مرد حق بین کو بھی پیدا کر دیا، جس کے عصائے کلیمی کی ایک ہی ضرب سے یہ جمِ اکبر پاش پاش ہو کر رہ گیا،

بے معجزہ دنیا مین ابھرتی نہین قومین
جو ضرب کلیمی نہین رکھتا وہ ہنر کیا

میری مراد حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی سے ہے، جنھون نے صرف علمی جہاد ہی نہین کیا، بلکہ وقت کی برسر اقتدار طاقت نے آپ کو قید و بند اور ہر قسم کی بلا و آزمایش مین ڈالا، مگر ان کے عزم و ہمت مین بال برابر بھی فرق نہ آسکا،

عشق بازی را تحمل بایدا ے دل عشق باز
گر بلائے بود بود و گر خطائے رفت رفت

عالمگیر کی موت کے بعد سلطنت اسلامی حالتِ نزع مین مبتلا ہو گئی، ایک نیم مردہ جسم تھا، جس مین مدافعت کی طاقت باقی نہین تھی، مگر مرتے مرتے بھی اس سخت جان نے کافی عمر حاصل کر لی، اندرونی خلفشار، خلاف و نزاع نے اسے کھوکھلا کر دیا تھا، مگر آخری سانس تک افتان و خیزان قدم بڑھاتی چلی گئی، مگر تا کجے؟ آخر گری، تڑپی، اور جان دیدی،

اس آخری دور مین کئی مردانِ حق شناس پیدا ہوئے، ان مین حضرت شاہ ولی اللہ، مولینا اسمٰعیل شہید اور سید احمد شہید کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہین، ان حضرات نے خالص اسلامی رنگ مین اسلامی نظریۂ حیات کو بروئے کار لانے کی مجاہدانہ جد و جہد کی، ان کی علمی کاوشون اور سر فروشانہ سرگرمیون نے اگرچہ وقتی طور پر

کوئی نمایان کامیابی حاصل نہ کی، مگر ملتِ اسلامی کی تعمیر فکر مین ان کو کافی دخل ہے،

یہ دور صرف مسلمانان ہند ہی کے لئے پر فتن نہ تھا، بلکہ تمام عالم اسلامی ایک خطرناک انقلاب کے دروازہ پر کھڑا تھا، اور تمام اسلامی سلطنتین اس آگ کے شعلہ کے لپیٹ مین آگئی تھین،

دول یورپ مسلمانانِ عالم کی مرکزیت کو نیست نابود کرنے کے لئے کس طرح لگاتار کوشش کرتی رہین، اور کس طرح وہ اپنے اس مقصد مین کامیاب ہوئین؟ یہ تاریخ عالم کا ایک افسوسناک باب ہے، مگر اس سے زیادہ افسوسناک خود مسلمانون کا نامۂ اعمال ہے، جس پر جس قدر ماتم کیا جائے کم ہے، اغیار کی ریشہ دوانیان تو زمانۂ رسالت سے جاری رہین، مگر جب تک مسلمانون کا قومی کردار مضبوط و مستحکم رہا، اس وقت تک وہ ہر بیرونی طاقت کا کامیاب مقابلہ کرتے رہے، اور جو طاقت اُن سے ٹکرائی، وہ خود پاش پاش ہو کر رہ گئی، مگر دنیائے اسلام کے لئے وہ منحوس ترین دن تھا، جب کہ پہلی دفعہ ملتِ اسلامیہ کی بنیان مرصوص مین رخنہ پیدا ہوا، یہی وہ خطرناک فتنہ تھا، جس کی نسبت خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے ہی خبر دی تھی،

التی تموج کموج البحر (بخاری) جو سمندر کی طرح ٹھاٹھین مارتا ہوا آئے گا، اور مسلمانون کے قومی وقار کو خس و خاشاک کی طرح بہالے جائے گا، مگر پھر بھی جب تک مسلمانون کی حیاتِ اجتماعیہ مین اسلامی فکر و عمل کا کم سے کم حصہ بھی موجود رہا، تمام دنیا پر فرمان روائی کرتے رہے، ان کی افواج نے دنیا کا چپہ چپہ چھان مارا، اور جو لوگ اسلامی جھنڈے کو سرنگون کرنے کے لئے آگے بڑھے، وہ خود ہی اس کے آگے سرنگون ہو گئے، مگر انیسوین صدی کے اوائل مین دنیائے اسلام کو ایسے سخت حالات سے دوچار ہونا پڑا کہ وہ ان کی تاب نہ لا سکے، لیکن نہایت رنج و افسوس سے کہنا پڑتا ہے، کہ عالم اسلامی کی تباہی و بربادی مین اغیار کی فتنہ انگیزیون کو اتنا دخل نہین، جتنا کہ غدارانِ ملت کی سیہ کاریون کو ہے،

من آنچہ دیدہ ام ز دل دیدہ دیدہ ام
گاہے ز دل کنم گلہ گاہے ز دیدہ ام

علامہ افغانی کا ایک مضمون

اس سلسلہ میں اس زمانہ کے بطلِ جلیل اور مُدبر اعظم علامہ جمال الدین افغانیؒ کے ایک مضمون کا ترجمہ ذیل میں درج کرتا ہوں، جس سے اندازہ ہو سکے گا کہ اس زمانہ میں دنیاے اسلام کن مصائب سے دوچار ہو رہی تھی، اور ان مصائب کی زیادہ ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟ فرماتے ہیں،

"شاہ سلطان حسین کے زمانہ میں روسی جب اصفہان پر حملہ آور ہوئے تو عثمانیوں نے روس کی حمایت کی، بلکہ ایران کے مقابلہ میں روس کو مدد بہم پہنچائی گئی، یہ کتنا احمقانہ فعل تھا، اور انھوں نے اتنا بھی محسوس نہ کیا، کہ روس ترکوں کے ساتھ آج تک کیا معاندانہ سلوک کرتا رہا ہے، ترکی مقبوضات مثلاً بلغاریہ، یونان اور رومانیہ میں اس نے کیا ریشہ دوانیاں شروع کر رکھی ہیں، نتیجہ یہ ہوا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ روس آذر بائی جان کے کئی مقامات پر قابض ہو گیا، ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

عباس مرزا جب روس کے ساتھ لڑ رہا تھا، تو عین اسی زمانہ میں ترکوں نے ایران سے جنگ چھیڑ دی اور اس مداخلت کی وجہ سے، روس آذر بائی جان کے کئی شہروں پر قابض ہو گیا، سلطان ٹیپو کا سفیر دربار ترکی میں گیا، اور اس نے سلطان کی طرف سے پیشکش کی، کہ ہندوستان کے بعض علاقوں کے عوض بصرہ ان کے حوالہ کیا جائے، مگر ترکی نے اس پر توجہ نہ دی، اور سفیر ناکام واپس آگیا، سلطان ٹیپوؒ کا مقصد یہ تھا، کہ ترکوں کا ہندوستان میں اثر و نفوذ پیدا ہو جائے، اور انگریزوں کی قوت کو توڑا جائے، اگر ترک اس وقت اس پیشکش کو مان جاتے، تو آج دنیا کا نقشہ شاید کچھ اور ہی ہوتا، جس زمانہ میں افغانیوں نے ہندوستان کو انگریز کے تسلط سے نکالنے کی جد و جہد شروع کی اور ہندوستان پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا، تو فتح علی شاہ ایران نے انگریز کو خوش کرنے کے لئے افغانستان کو چیلنج کر دیا مگر اُس نے اتنا بھی غور نہ کیا، کہ افغانیوں کے خلاف انگریز کے ہاتھ مضبوط کرنا خود ایران

کے لئے کس درجہ خطرناک ثابت ہو سکتا ہے، امیر دوست محمد خان والی افغانستان نے انگریز کا مقابلہ کرنے کے لئے رنجیت سنگھ سے معاہدہ کیا، اور پھر انگریز کے طلسم میں گرفتار ہو کر رنجیت سنگھ کو میدان جنگ میں تنہا چھوڑ دیا، اگر دوست محمد خان میں کچھ بھی سیاسی شعور ہوتا، تو رنجیت سنگھ سے ہر قیمت پر تعاون کرتا، کیونکہ پنجاب کی حکومت افغانستان کو انگریزی خطرہ سے محفوظ رکھ سکتی تھی، اس طرف ہندوستان میں نواب بنگال اور نواب کرناٹک اغیار کا آلۂ کار بن گئے، نواب لکھنؤ نے تیموری سلطنت کو ضعف پہنچایا، نواب دکن نے ٹیپو شہید کے مقابلہ میں انگریز کا ساتھ دیا"

"اسمٰعیل پاشا خدیو مصر نے اپنی خود مختاری کے لالچ میں ترکوں سے بغاوت کی، اور یورپ کے بنیوں سے گران شرح سود پر قرضہ لیا، اور اس طرح ملک کو انگریز کے ہاتھ بیچ دیا"

اس مضمون میں علامہ افغانی نے جن دردناک واقعات کا ذکر کیا ہے، ان کے تصور سے بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، دراصل علامہ کی سرفروشانہ سرگرمیاں اس زمانہ سے تعلق رکھتی ہیں، جو عالم اسلامی کے لئے انتہائی یاس انگیز دور تھا، ہندوستان پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت مسلط ہو رہی تھی، ترکی کو تباہ کرنے کے لئے دولِ یورپ کی دسیسہ کاریاں مسلسل جاری تھیں، الجیریا، ٹیونس اور مراکو پر فرانسیسی انتداب چھا چکا تھا، طرابلس اٹلی کے چنگل میں گرفتار تھا، اور دوسری طرف روس بخارا اور آذر بائیجان پر قبضہ جما رہا تھا، یہ حالات تھے، جن سے تمام دنیاے اسلام دوچار ہو رہی تھی اور اس پر آشوب دور میں تنہا علامہ افغانیؒ کی آواز بد امنی و بے چینی کی ان فضاؤں میں گونج رہی تھی،

اب ظاہر ہے کہ اقوام غالبہ جہاں انسانوں کے اجسام پر حکومت کرتی ہیں، وہاں ان کے اذہان و افکار کو بھی ایک خاص قالب میں ڈھالنے کی کوشش کرتی ہیں، اور مفتوح اقوام کے فکری اور ذہنی قویٰ میں وہ ربط باقی نہیں رہتا، اور نہ ہی اجتماعی احساسات میں وہ قوت موجود ہوتی ہے، جو

خارجی اثرات کے لئے مانع ہو سکے، ورنہ ظاہر ہے کہ جب تک قومون کے ذہنی قومی مین ربط و تسلسل اور اجتماعی احساسات مین قوت و استحکام موجود رہتا ہے، اس وقت وہ اغیار کے غلبہ و تسلط کو قبول ہی نہین کرتین،

چونکہ اس دور مین مسلمانون کا سیاسی اقتدار ختم ہو گیا تھا، اس لئے اقوام غالبہ کے جاہلی تصورات کو انھون نے نہایت آسانی کے ساتھ قبول کرنا شروع کیا، اور ان کے نظام اجتماع و تمدن مین اسلامی نظریۂ حیات کا جو تھوڑا بہت اثر باقی تھا، وہ بھی زائل ہونے لگا، اور مسلمان عجیب ذہنی کشمکش مین مبتلا ہو گئے تھے،

(باقی)

حیاتِ شبلی

(حصۂ اول)

حیات شبلی جس کا مدتون سے شائقین کو انتظار تھا، چھپ کر شائع ہو گئی ہے، یہ کتاب تنہا علامہ شبلی مرحوم کی سوانحمری نہین ہے، بلکہ اس مین اُن کی وفات ۱۹۱۴ء تک اس سے پہلے کی ایک تہائی صدی کی ہندوستان کے مسلمانون کی مذہبی، سیاسی، علمی، تعلیمی، اصلاحی اور دوسری تحریکون اور سرگرمیون کی مفصل تاریخ آگئی ہے، کتاب کے شروع مین جدید علم کلام کی نوعیت، اس کی حیثیت، اور اس سے متعلق علامہ شبلی مرحوم کی علمی خدمات پر تبصرہ ہے، پھر بلجی اور تغلق کے زمانہ سے لے کر انگریزی حکومت کے آغاز تک صوبہ آگرہ و اودھ کے مسلمانون کی علمی و تعلیمی تاریخ کو بڑی تلاش و جستجو سے مرتب کیا گیا ہے، اور اکابر علماء کے حالات بڑی محنت سے جمع کئے گئے ہین، ضخامت مع دیباچہ و مقدمہ وغیرہ کے ۹۰۰ صفحے ہے، قیمت غیر مجلد علاوہ محصول ڈاک صرف آٹھ روپیہ، مجلد لعہ

"منیجر"

گھکڑ نامہ

از

مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی ریسرچ اسکالر گجرات ورناکلر سوسائٹی احمد آباد

(۲)

فرشتہ نے آگے چل کر محمود غزنوی کے حالات مین تحریر کیا ہے کہ ۳۹۹ھ مین محمود نے ہندوستان پر پھر فوج کشی کی، انند پال (راجہ پنجاب) یہ معلوم کر کے بے حد پریشان ہوا، آخر اس نے ہندوستان کے دوسرے راجون سے مدد مانگی، اجین، گوالیار، کالنجر، قنوج، دہلی اور اجمیر نے اس کی کافی مدد کی، وہ میدان جنگ مین اترا، ہندو گھگڑون نے اس کی طرفداری کر کے اس کے ساتھ شرکت کی، محمود نے ہندی فوج کی کثرت اور حملہ کی تیزی دیکھ کر لشکر گاہ کے گرد خندق کھودنے کا حکم دیا، لیکن جنگ کے درمیان مین گھگڑ خندق پار ہو کر لشکر مین گھس آئے، اور اس تیزی سے حملہ کیا کہ غزنوی فوج کے تیار ہونے تک تین چار ہزار مسلمان شہید ہو گئے،[1]

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے، کہ گھگڑون کی آبادی جمون سے شکست کھانے کے بعد دو جگہون مین تقسیم ہو گئی تھی، شاہی خاندان، امراء، اور فوجی اشخاص کابل چلے گئے تھے، اور عام آبادی جمون یا زیرین کشمیر مین رہی، جو اپنے مذہب پر قائم تھی،

مؤلف کہتا ہے، کہ ۳۶۹ھ مین شاہ کابل کی مدد سے سلطان ناصر الدین سبکتگین نے ہندوستان

---

[1] فرشتہ جلد اول ص ۲۸، ۲۹ حیدر آباد،

پے در پے حملے کئے، اور شاہ کی جرأت، ہمت، اور جنگی قابلیت دیکھ کر اس کو سپہ سالار بنادیا، اور صوبہ کابل کو اپنے ملک کے ساتھ الحاق کرکے اس کو وہان کا صوبہ دار قرار دیا، کچھ عرصہ کے بعد وہ وفات پاگیا، کوہ تخازمان "عاشقان" پر اس کی قبر بنائی گئی، اس کے پانچ لڑکے تھے، گھگڑ شاہ سب سے بڑا تھا وہی تخت نشین ہوا، ۳۸۷ھ مین سلطان سبکتگین کا انتقال ہوگیا، اور سلطان محمود تخت پر بیٹھا، اس نے گھگڑ شاہ کو کابل کی صوبہ داری پر برقرار رکھکر، اس کی عزت افزائی کی" گو اس بیان کی تائید کسی تاریخ مین میری نظر سے نہین گذری، لیکن یہ کوئی ایسی بات نہین ہے جو ناممکن معلوم ہو، کیونکہ غزنوی فوج مین بکثرت ہندو نظر آتے ہین، اور بڑے بڑے عہدون پر ممتاز ہین، جیسا کہ بیہقی اور فرشتہ مین مذکور ہے،

اس کے بعد مؤلف نے لکھا ہے کہ سنہ ۴۱۲ھ (سنہ ۱۰۲۱ء) مین سلطان محمود نے گھگڑ شاہ کو "پوٹ ہار" کا علاقہ جو دریائے بہٹ (جہلم) اور سندھ کے درمیان تھا، بطور جاگیر کے عنایت فرمایا، اور کابل کی صوبہ داری اپنی جگہ بحال رہی، منشا یہ تھا کہ ہندوستان اور خراسان کے دروازہ کی حفاظت بخوبی ہوسکے، اس کے علاوہ جب سلطان نے دیکھا کہ ہندوستانی گھگڑ تکلیف دہ ہین تو اس نے کابلی گھگڑون کو پوٹ ہار (زیرین کشمیر) کا علاقہ دے کر لوہے کو لوہے سے کاٹنے کی تدبیر اختیار کی، دوسرے جیپال کا ایک بازو زخمی کردیا، تیسرے کشمیر کے لوہ کوٹ پر حملہ کے وقت یہ لوگ بہترین مددگار ثابت ہون،

ابوالفضل نے آئین اکبری مین لکھا ہے، کہ سلطان زین العابدین کشمیری کے عہد مین ملک کد نامی غزنہ کے ایک سردار نے جو حاکم کابل سے تعلق رکھتا تھا، اس جگہ آکر بزور یہ علاقہ (پوٹ ہار) کشمیریون سے چھین لیا، جو جہلم اور سندھ کے درمیان ہے،[1] میرے خیال مین مصنف کے بیان اور ابوالفضل کی

[1] آئین اکبری ج ۳، ص ۴۲۳ و ۴۲۴ کلکتہ،

تحریر مین توافق کی صورت یہ ہوسکتی ہے، کہ کچھ لوگ جو کابل اور غزنہ مین رہ گئے تھے، وہ بھی اس عہد مین آکر اپنی قوم سے مل گئے، غرض گھگڑ قوم غزنویون کے آخر عہد تک آزادی اور شجاعت کے ساتھ اپنے مقبوضات کے تحفظ اور دفاع مین مصروف رہی،

مؤلف نے لکھا ہے کہ سلطان راجہ ایک دن شکار کے لئے دریائے بہٹ (جہلم) کے اس پار گیا، اور تیتر کو باز پر حملہ کرتے دیکھ کر اس زمین کی آب و ہوا کے صحت بخش ہونے کا یقین کیا، اور واپسی کے بعد ایک جرار لشکر کے ذریعہ اس ملک کو فتح کرکے ۵۰۵ھ مین "دانگلی" نامی ایک شہر آباد کیا، اور اسی کو پایہ تخت قرار دیا، مؤلف کا بیان ہے کہ ایک سو چودہ برس چانہ و نیمبر مین رہ کر دانگلی مین پایہ تخت تبدیل کیا، اس حساب سے معلوم ہوا، کہ محمود غزنوی نے یہ علاقہ سنہ ۳۹۱ھ مین ان کو بخشا تھا، حالانکہ مؤلف نے اس کا سنہ ۴۱۲ھ تحریر کیا ہے، راقم الحروف کے خیال مین کچھ لوگ پہلے سے چانہ مین آباد تھے، اور ۳۹۱ھ مین ان کا یہ مرکزی مقام ہوگا، پھر گھگڑ شاہ نے اس سے فاصلہ پہ نیمبر آباد کیا ہوگا، اس لحاظ سے دونون کی مدت ملاکر ایک سو چودہ برس ہوجاتی ہے،

سنہ ۴۷۲ھ کے ضمن مین فرشتہ نے سلطان ابراہیم کے شہر درہ فتح کرنے کا حال لکھا[1] اس کا بیان ہے کہ یہ لوگ (اہل درہ) خراسانی الاصل تے، جن کو ترکون نے وہان سے نکال دیا تھا، میرا خیال ہے کہ یہ قطعی غیر مسلم گھگڑ تھے، اور جس تالاب کا ذکر کیا ہے، وہ بابر کے عہد تک موجود تھا، یہ گھگڑون کے مختلف قبائل مین سے ایک تھا، ان کا سب سے بڑا سردار مہ پال نامی تھا،

تاریخ فرشتہ مین ہے کہ (سنہ ۶۰۲ھ) شہاب الدین غوری کے قتل کی جھوٹی خبر سے بدامنی ہوگئی،

[1] فرشتہ جلد اول ص ۱۸۸ حیدرآباد،

کوہ جود وغیرہ کے گھکڑوں کے سردار مسمّٰی "سرکہ" نے بھی حکمرانی پر کمر باندھی، اور لاہور پر حملہ کیا، سرکہ کے اس حملہ سے دریائے جہلم اور سودرہ کے درمیانی علاقے میں جنگ کی آگ بھڑک اٹھی،[1]

لیکن اس کتاب میں مؤلف نے (۶۰۰ھ) سرکہ نام کا کوئی سردار نہیں لکھا ہے، اس لئے سمجھنا چاہئے کہ اس نام میں تحریف ہوئی، ۵۹۰ھ میں "سیلہر خان" تھا، ممکن ہے اسی سیلہر سے "سرکہ" بن گیا ہو،

گھکڑوں کا اسلام

مؤلف نے تاریخ فرشتہ کے حوالہ سے تحریر کیا ہے، کہ سلطان محمد غوری نے ان کو مسلمان بنایا، اور اسی قوم کے ہاتھ سے شہید ہوا، (واللہ علم بالصواب)

فرشتہ کی تاریخ ۱۰۱۵ھ / ۱۰۱۸ھ میں تالیف ہوئی، (فرشتہ جلد اول ص ۳۵) اور مؤلف تاریخ گھکڑ نے تکمیل کی تاریخ ۱۱۳۰ھ تحریر کی ہے، وہ خود اس ملک کا رہنے والا ہے، جس کی تاریخ لکھ رہا ہے اور اسی سے متصل کھوکھر بھی رہتے تھے، اس لئے یقیناً وہ اپنے پڑوسی کھوکھروں سے واقف ہوگا، پس فرشتہ کی تالیف سے تقریباً سوا سو برس بعد کے نسخے میں اس نے لفظ گھکڑ پڑھا، اور سمجھا، یعنی اس کو کھوکھر نہیں پڑھا، اس سے شبہہ ہوتا ہے کہ غالباً اس کے عہد تک زبانی روایت بھی یہی تھی، کہ سلطان کو گھکڑوں نے شہید کیا، لیکن مولف کو خود اس کا یقین نہیں ہے اسی لئے اس نے آخر میں "واللہ علم بالصواب" کا اضافہ کر دیا،

فرشتہ نے ان کے اسلام قبول کرنے کی روایت اس طرح درج کی ہے کہ ۶۰۰ھ میں ہندوستان کی بغاوت فرو کرنے کے لئے سلطان پنجاب میں آیا، اور امن قائم ہو جانے کے بعد وہ لاہور میں مقیم تھا، کہ گھکڑوں کے حالات معلوم ہوئے، انھوں نے لوٹ مار سے

---

[1] فرشتہ جلد اول ص ۲۲۲،

راستہ بند کر رکھا تھا، تمام راستے خطرناک ہوگئے تھے، یہ لوگ غیر متمدن تھے، کسی خاص مذہب کے پابند نہ تھے، لڑکیاں فروخت کرتے تھے، کثرت بعول کی رسم جاری تھی،[1] سلطان کے آخر عہد میں (غالباً جب وہ لاہور میں تھا) ایک صالح مسلمان بطور قیدی کے ان کے یہاں پہونچا، اس کے اخلاق و عادات اور طریقۂ عبادت سے اس قوم کا سردار بڑا متاثر ہوا، اس نے پوچھا، کہ اگر میں سلطان کے پاس جاکر اسلام قبول کروں تو میرے ساتھ کیا سلوک کریگا، مسلمان نے جواب دیا، کہ اس کا میں ذمہ لیتا ہوں کہ وہ تیرے ساتھ بہتر سلوک کریگا، اور اس کوہستان کی حکومت تجھ کو عطا کرے گا، چنانچہ اس مرد صالح کے خط پہنچتے ہی سلطان نے خلعت اور مرصع کمر بند اس کو بھیجا اور دربار میں طلب کیا، وہ گیا، اور مسلمان ہو کر حکومت کا پروانہ ساتھ لایا، سردار قوم نے واپسی پر اپنی قوم میں تبلیغ کی، جس سے کثیر حصہ اسلام میں داخل ہوا، لیکن دور دراز مقاموں کے لوگ اپنے مذہب پر قائم رہے،، پھر لکھتا ہے کہ کوہستان کی ایک اور قوم کو جو تیراہ میں رہتی تھی سلطان نے اس کو بھی نرم و گرم طریقہ سے دائرۂ اسلام میں داخل کیا،[2] گو اس کی تائید کسی دوسری تاریخ سے نہیں ہوتی، اور خود مولف نے بھی اس پر روشنی نہیں ڈالی، پھر بھی یہ کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں ہے جس کو عقل قبول نہ کرے، کیونکہ تاریخ اسلام میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں،

لیکن ایک بات میرے دل میں بار بار کھٹکتی ہے، کہ کابلی گھکڑوں کی مصالحانہ روش کے سبب سے سبکتگین ان سب کا بڑا قدردان تھا، ان کو سپہ سالاری تک دی تھی، اور محمود غزنوی کے عہد میں بھی ممتاز رہے، البتہ سیاسی مصالح کی بنا پر ان کو کابل سے پوٹھار منتقل کر دیا گیا، پھر بھی

---

[1] قدیم ہندو قوم میں یہ رسم عام تھی، ہندوستان کا ہر مورخ اس کو جانتا ہے، اور میں نے سنا ہے کہ تبت میں آج بھی اس کا رواج بعض جگہ موجود ہے، اس لئے یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے، کیونکہ گھکڑ تبت سے آئے، یہاں اس کا عام رواج تھا، جیسا کہ تاریخوں میں مذکور ہے [2] فرشتہ جلد اول ص ۲۲۲

نوازش شاہانہ سے مستفید ہوتے رہے، کابل کی صوبہ داری بھی سردار قوم کے ہاتھ مین رہی، اسی قسم کی نوازش جب ترکون اور ہندوون کے ساتھ کی گئی، تو قوم کی قوم یا کثیر حصہ مسلمان ہو گیا، ایسی صورت مین کیونکر یقین کیا جا سکتا ہے، کہ اس قوم کے لوگ مشرف باسلام نہ ہوئے ہون، اس لئے قیاس چاہتا ہے، کہ ان کی بڑی تعداد عہد غزنویہ (۳۶۶ھ تا ۵۵۵ھ) مین اسلام لائی ہو، اور بعض قبائل (ہندو) جو ابھی تک اپنے مذہب پر قائم تھے، وہ غوری سلطان کے عہد مین اسلام لائے ہون، تاریخ مین اس کی مثال خود غوریون کا قبیلہ ہے، جو سبکتگین کے عہد مین مسلم اور غیر مسلم دو حصون مین منقسم تھا، گھگڑون کا سب سے بڑا سردار اس عہد مین سلطان منگ تھا، جس نے ۵۹۰ھ سے ۶۴۲ھ تک باون برس حکومت کی،

سلطان شہاب الدین غوری کی شہادت

سلطان محمد شہاب الدین غوری کی شہادت کے متعلق بحث طلب امر یہ ہے، کہ کس قوم نے اس کو شہید کیا، تاریخون مین صرف فرشتہ ہی منفرد تاریخ ہے، جس مین گھگڑون کا نام آتا ہے، ورنہ تمام تاریخین اس پر متفق ہین، کہ یہ کام کھوکھرون نے کیا، کھوکھر شمالی مغربی ہند کی مشہور قوم ہے، اور ہمیشہ حملہ آورون کے حق مین کانٹے کی طرح کھٹکتی رہی ہے، اسلام قبول کرنے کے بعد جب تک بڑے بڑے عہدون پر قابض نہ ہو گئی، اس نے حکمرانون کو چین سے بیٹھنے نہ دیا، انگریزی عہد سے پہلے ہندوستان کے دوسرے صوبون مین بھی آباد ہو چکے تھے، چنانچہ مظفر شاہ اول گجراتی کے عہد مین کھوکھرون کا ایک خاندان ملک جلال کھوکھر ناگور مین موجود تھا[1]، اس کے بعد وہ گجرات مین پھیل گئے، اور آج بھی کتیانہ (کاٹھیاواڑ) مین متعدد زمیندار موجود ہین، بخلاف گھگڑون کے جو اپنے وطن کو ترک کرنا کسی طرح پسند نہین کرتے،

معارف جلد ۱۵ ص ۲۴۴ مین میرے مکرم دوست مولوی سید ریاست علی صاحب نے

[1] طبقات اکبری ج ۳ ص ۹۲ کلکتہ،

اس عنوان پر سیر حاصل بحث کی ہے، جس پر کسی مزید اضافہ کی ضرورت محسوس نہین کرتا، ان کی تحقیقات کا جو لب لباب ہے وہ مین درج کرتا ہون،

اسلامی تاریخون مین کسی جگہ بھی گھگڑون کا نام نہین آیا ہے، طبقات ناصری مین "فدائی ملاحدہ" جوینی مین "ہندو فدائی" "گزیدہ" مین "ہندو کھوکھر فدائی" "کامل لابن اثیر" مین "کافر کھوکھر" ابن خلدون مین صرف "کھوکھر" اور بدایونی نے بھی صاف طور پر کھوکھر ہی تحریر کیا ہے، لیکن ابن اثیر کے بیان سے مزید بات یہ معلوم ہوئی کہ واقعہ شہادت مین کھوکھرون کے ساتھ اسماعیلی فدائی بھی شامل تھے، (جو غالباً ملتانی یا سندھی) ہون گے، کیونکہ قاتلون مین دو مقتول (یعنی اسماعیلی مسلم) بھی نظر آئے، اور یہ بات قرین قیاس یون ہے، کہ سلطان نے ملتانی اسماعیلیون اور کھوکھرون کو جنگ کر کے تباہ کر دیا تھا، اس لئے انھون نے طے شدہ اسکیم کے مطابق کھوکھرون کو ملا کر اس کام کو انجام دیا،

فرشتہ کی غلطی

میرے خیال مین اس معاملہ مین فرشتہ کو غلط فہمی ہو گئی ہے، قاسم فرشتہ ایران سے سیدھا دکن پہنچا، اور وہین اس نے ساری زندگی گذاری، اس لئے جس قدر واقفیت اس ملک کے لوگون سے ہے، شمالی ہند سے نہین ہے، وہ صرف ایک بار لاہور تک جہانگیر کے عہد مین بطور سفیر گیا ہے، مادری زبان بھی اس کی فارسی تھی، اس لئے وہ کھوکھر اور گھگڑ مین فرق نہ کر سکا، اس کے برعکس عبدالقادر بدایونی ہے، جو اسی ملک کا باشندہ ہے، ہندی زبان سے واقف اور اکبر کے ساتھ شمال مغرب مین بارہا جا چکا تھا، اسی لئے اس نے دونون قومون کو الگ الگ تحریر کیا ہے، یہ رائے مین نے اس لئے قائم کی ہے، کہ گو کتابت کی غلطیان بھی غلط فہمی کے لئے معاون ہوتی ہین لیکن طباعت سے قبل جو نسخے اس وقت تھے ان مین بھی ان دونون قومون کی تفریق نہ تھی، اور اسی لئے تاریخ گھگڑ کے مؤلف نے بھی

اس کو کھوکھر کے بجائے گھگڑ ہی پڑھا، حالانکہ وہ فرشتہ سے قریب تر زمانہ یعنی محمد شاہ ۱۱۳۶ھ کے عہد میں تھا، اور پھر جب خود فرشتہ نے لکھا ہے کہ گھگڑ قوم کی بڑی تعداد شہاب الدین غوری کے آخری عہد میں خوشی سے مسلمان ہو گئی، اور سلطان نے اس کو خلعت بھیج کر اپنی خوشنودی کا اظہار کیا، اور پھر اس علاقہ کا مستقل حاکم بنا کر اس کے نام کا فرمان جاری کیا، تو یہ بات ذرا بعید از عقل معلوم ہوتی ہے، کہ اس قوم کے کسی شخص نے اس کو قتل کیا ہو، یہ تسلیم کر لینے پر بھی کہ قاتل غیر مسلم تھے، یہ بات غور طلب ہے، کہ ایسی اہم سازش کا پتہ مسلم گھگڑوں کو نہ ملسکا، جبکہ قربت مکانی اور عزت افزائی کے سبب ہر وقت اس جگہ موجود رہتے ہوں گے،

وفاداری | اس قوم کی تاریخ کو اگر آپ گہری نظر سے دیکھیں گے، تو آپ کو ماننا پڑیگا، کہ گھگڑ قوم باوجود شجاع ہونے کے وفاداری ان کی فطرت میں ہے، ان کی ہزار سالہ تاریخ میں بمشکل ایک دو مثال محسن کشی کی ملے گی، سبکتگین کی نوازش خسروانہ کے عوض اس نے ہمیشہ وفاداری سے کام لیا، اور غزنویوں کے آخر عہد تک ان کا دم بھرتے رہے، بابر اور ہمایوں کے فیاضانہ سلوک نے ان کو اس قدر گرویدہ کر لیا، کہ بڑے بڑے سرداروں نے شیر شاہ اور سلیم شاہ کے مقابلہ میں اپنی جانیں قربان کر دیں، اور پھر اکبر کے وقت سے مغلیہ سلطنت کی آخری سانس تک یہ لوگ وفادار رہے، سکھوں کے مظالم سے انگریزوں نے نجات دلائی، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ لوگ نہ صرف یہ کہ انگریزوں کے دست و بازو ثابت ہوئے، بلکہ وہ ایسے پکّے وفادار ہو گئے، کہ سکھوں کی وفاداری میں خلل آگیا، جس پر انگریزوں کو بڑا ناز تھا، لیکن آج تک اس قوم کی وفاداری قطعاً مسلم ہے، بات صاف ہے کہ یہ قوم محسن کش نہیں ہے،

پایۂ تخت | مؤلف کے بیان کے مطابق ان کا پہلا پایہ تخت اصفہان تھا، پھر خراسان، اس کے بعد وہ تبت آئے، پھر کشمیر (غالباً جموں) پھر کابل، اور جب تعلقہ پوٹھار میں مستقل جاگیر دا

ہوئے تو ایک سو چودہ سال تک چانہ او پنیر میں رہے، ۸۰۶ھ میں دانگلی، اس کے بعد پربالہ اور آخر ۱۱۶۳ھ میں اکلیانہ کو مستقل دار الحکومت بنایا،

مذہب | ابتدا میں یہ قوم آتش پرست تھی، جب یہ لوگ تبت پہنچے تو قیاس چاہتا ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد ملکیوں کے اثر سے یہ لوگ بدھ ہو گئے ہوں گے، لیکن جب وقت کشمیر سے کابل گئے تو اس وقت یہ لوگ ہندو مذہب کے پیرو تھے، بیرونی نے صاف طور پر لکھا ہے، کہ کابل کا شاہیہ خاندان ہندو تھا، غالباً سورج دیوتا کو مانتے ہوں گے، کیونکہ تاریخوں میں ہم دیکھتے ہیں، کہ جو قومیں ایران کی طرف سے آئیں ان میں سے اکثر سورج دیوتا کے ماننے والے ہیں، جیسے جٹ، گوجر، راجپوت وغیرہ، میرے خیال کے مطابق غزنوی عہد میں یہ مسلمان ہوئے، اور فرشتہ کی تحریر کے موافق سلطان شہاب الدین غوری کے عہد میں یہ لوگ اسلام سے مشرف ہوئے،

تعداد | اس قوم کی صحیح تعداد بتانی تو مشکل ہے، لیکن عقل خود اس بات کی مدعی ہے کہ ان کی تعداد کافی ہونی چاہئے، افسوس ہے کہ مؤلف نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی، لیکن یہ مسئلہ یوں حل ہو جاتا ہے، کہ اس قوم کے مختلف قبیلے الگ الگ رہتے تھے، اور جب کبھی جنگ کا موقعہ آتا تھا، تو پانچ پانچ ہزار کی تعداد میں فوجی سوار میدان میں نکل آتے تھے، ظاہر ہے کہ عورت، بچّے، بوڑھے، غلام، نوکر وغیرہ ان کے علاوہ ہوتے ہوں گے،

فرشتہ نے گھگڑوں کے اسلام قبول کرنے کے حالات تحریر کرنے کے بعد لکھا ہے، کہ شہاب الدین غوری اسی سال تیراہ کی طرف گیا، جو غزنہ اور پنجاب کے درمیان ہے، اور وہاں کے لوگوں کو بھی نرمی اور گرمی سے اپنا فرمان بردار بنا کر اسلام میں داخل کیا، اور ان دونوں قوموں کی تعداد تقریباً چار لاکھ تھی[1]،

---

[1] فرشتہ جلد اوّل ص۵۸ بیان شہاب الدین غوری نول کشور لکھنؤ،

اس مین سے تیراہ کا علاقہ پہاڑی ہے، اس مین اس قدر سرسبزی اور شادابی نہین جس قدر دوآبہ جہلم (پوٹ ہار) مین ہے، اس لئے ضرور ہے کہ یہان کی آبادی تیراہ سے زیادہ ہو، لیکن بالفرض نصف ہی مان لین جب بھی غوریون کے عہد مین (۶۰۲ھ) دو لاکھ کی تعداد شمار مین آتی ہے،

خطابات | اس معاملہ مین مؤلف نے ابتداء سے غلط فہمی پیدا کرنے والے الفاظ استعمال کئے ہین، اس لئے اس کو نظر انداز کر کے میری تحقیق مین جو آیا ہے وہ درج ذیل کرتا ہون،

ابتدا مین یہ لوگ جب اصفہان مین تھے، تو بحیثیت شاہزادے کے خاندانی خطاب "کے" سے ممتاز تھے، جس کا آخری شخص "کے گوہر" ہے[1]، اس کے بعد جب تبت مین آبسے، اور ہندوستانی قوم مین مل کر رہنے لگے، تو "راجہ" کا خطاب اختیار کیا، جیسے کید راجہ[2] وغیرہ، کشمیر اور جمون تک غالباً یہی خطاب رہا، اس کے بعد جب وہ کابل پر قابض ہوئے، تو انھون نے شاہ کا خطاب اختیار کیا، اور خاندان شاہیہ سے[3] مشہور ہوئے، اور جب شاہی خاندان کابل سے پوٹ ہار آیا، تو "بوگا" پہلا شخص ہے، جس نے اپنے نام کے ساتھ "ملک" استعمال کیا، اسی خاندان مین ہمت خان کو احمد شاہ ابدالی نے "راجہ" کا خطاب عنایت فرمایا، جو غالباً آج تک اس خاندان مین چلا آتا ہے، ملک گل محمد جس نے گلیانہ آباد کیا، اس کا پوتا ملک فیروز خان ہوا، اس کے لڑکے جھنڈا خان کو چودھری راول کہا جاتا ہے، اور غالباً آج تک ان کا خاندان چودھری کے نام سے مشہور رہے، مؤلف کے بیان کے مطابق ہاتھی خان پہلا آدمی ہے جس کو بابر بادشاہ نے خلعت کے ساتھ "سلطان" کا خطاب عنایت فرمایا، جو اس خاندان مین اس وقت تک رائج ہے، اس قوم مین لشکر خان پہلا شخص ہے، جس کے نام کے ساتھ "دیوان" کا لفظ اضافہ کیا گیا، سلطان جلال کے بھائی مرزا عمر خان اور مرزا اشرف کو مرزا کہا گیا، جو مغلیہ عہد مین عموماً شاہزادون کے لئے مقرر تھا، اور غالباً مغلیہ کے آخری عہد

---

[1] کے گوہر نامہ کا ابتدائی مقدمہ [2] تاریخ فرشتہ جلد اول کا مقدمہ [3] کتاب الہند بیرونی باب ۴۹ کا آخری حصہ،

مین جب صوبہ داری پر سرفراز کئے گئے، تو ان کو نواب بھی کہنے لگے،

انتظام مملکت | اگرچہ گھگڑ ایک جنگی قوم تھی پھر بھی ذاتی قابلیت اور اسلامی دربارون کی حاضری نے ان مین انتظامی قابلیت پیدا کر دی تھی، یہ مختلف قبیلون مین منقسم تھے، ہر قبیلہ کا سردار علیحدہ ہوتا تھا، اور ان سب کا سردار ایک ہوتا تھا، جس کو بادشاہ وقت کی طرف سے خلعت، خطاب اور سرداری کا مرتبہ ملا ہوتا، یہ سردار (سلطان) خود مختار ہوتا، مغلیہ سلطنت سے قبل کسی کو خراج نہین دیا، اس کے ماتحت ایک وزیر، ایک دیوان ہوتا، فوج کی سپہ سالاری خود ہی کرتا، جنگ کے وقت ہر قبیلہ اپنی فوج لے کر سلطان کے جھنڈے کے نیچے جنگ کرتا، مؤلف کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، کہ سکہ بھی ان کا اپنا ہوتا تھا، دیوان کے ماتحت محکمۂ دیوانی ہوتا، اس کے ماتحت متعدد منشی، اہل کار، متصدی، اہلمد، اور خادم ہوتے، لگان کی وصولی لائق ہوتی، کسی ماتحت قوم کی سرکشی پر فوج سے کام لیا جاتا، شکست کے بعد یا تو معافی مانگ کر آ رہتی، ورنہ ان کو اس جگہ سے بے دخل کر دیا جاتا، مغلیہ عہد مین فوجی تنظیم پر زیادہ زور دیا گیا، اور موجودہ تہذیب کے مطابق اسلحہ اور لباس سے آراستہ کیا جاتا، چنانچہ ہمارا خان نے پانچ ہزار سپاہی کو ایک رنگ کے لباس اور ایک رنگ کے گھوڑے پر سوار کر کے اکبر بادشاہ کی نظر سے گذارا، یہ بہادر اور غیرت مند قوم ہے، بہت کم ایسا ہوا ہے کہ میدان جنگ سے فرار کا عار اپنے سر لیا ہو، قانون گوئی کا عہدہ بھی قائم تھا، اور قوم بھگوتان (ہندو) اس عہدہ پر سکھون کی عملداری تک قائم رہی، اسی نے سلطان جلال خان کے عہد مین تمام گاؤن کی پیمایش کر کے جدید طریقہ سے مالگذاری تشخیص کی،

محکمۂ عدالت بھی ان کے یہان قائم تھا، اور مستقل طور پر ایک قاضی رہتا، اور غالباً بڑے مقامون مین ان کے نائب بھی رہتے تھے، اس قوم کے حکمرانون کی بڑی تعداد عادل گذری ہے

انصاف ان کا پیشہ تھا، بعض دفعہ تو ان کو انصاف دلانے کے لیے جنگ بھی کرنی پڑی ہے،
کاشتکارون اور عام رعایا کے ساتھ ان کا برتاؤ بہت ہی فیاضانہ تھا، لگان کی وصولی مین سختی سے
کام نہین لیتے تھے، اور یہی اوصاف تھے جن کے باعث اس قوم کی عمر لمبی ہو گئی، اور دوسرون مین
جذب ہونے سے بچ گئی، آخر زمانہ مین آپس کی نااتفاقی نے خانہ جنگی کی صورت اختیار کر لی، جس سے
ان کی ہوا اکھڑ گئی، اور ان پر سکھ غالب آگئے، اور آج بھی یہ قوم آپس کی خانہ جنگی، کینہ اور حسد سے
دل پاک کر کے متحد ہو جائے اور ایک سردار کی ماتحتی مین خوشی سے کام انجام دینے کو تیار ہو جائے
تو یقین مانیے کہ ان کی قدیم عظمت پھر واپس آسکتی ہے، اور اپنے ملک کا انتظام پھر ان کے ہاتھ آسکتا ہے
کوئی مرد خدا ہے؟ جو میری آواز پر کان دھرے،

مستورات | ان کی عورتین عفت مآب، غیرت مند اور شرع کی پابند ہوتی تھین، بزرگون کی عزت
کرتی تھین، اللہ والون کے ساتھ دلی عقیدت سے پیش آتی تھین، اپنی حکومت مین اپنی لڑکی کسی دوسری
قوم کو کبھی نہین دی، دوسرون کی لڑکیان بھی بہت کم لاتے تھے، اسی لئے ان کے خون مین وہ گرمی
آج تک رہی جو ایسی قوم کے لئے ضروری تھی، لونڈیون کا بھی رواج تھا، اور ان کے لڑکون کو بھی
وراثت مین حق ملتا تھا بلکہ حکومت تک مین ان کو حصہ ملا ہے،

رانی | اگر لوگ رضیہ بیگم، چاند بی بی، نور جہان اور اہلیا بائی پر فخر کر سکتے ہین تو گھگڑ لوگ
بھی اپنی ملکہ "رانی منگو" پر فخر کر سکتے ہین، دیوان اللہ داد خان کی یہ منکوحہ زوجہ تھی، وہ مردانہ لباس
پہن کر دیوان عام مین بیٹھتی اور ملک کا انتظام کرتی، وہ شاہانہ طریقہ سے تمام امور انجام دیتی، بلکہ جنگ
کے موقعہ پر اسلحہ سے مسلح ہو کر میدان جنگ مین نکلتی، چند دفعہ جنگ مین کامیاب بھی رہی، عالمگیر
اورنگ زیب نے بھی اس کو خلعت فاخرہ سے سرفراز فرمایا تھا، اس نے ملک پوٹھوار کو عدل سے
بھر دیا تھا، اس عفت مآب کی یاد مؤلف کے عہد تک لوگون کے دلون مین تازہ تھی، اس نے طبعی موت

سے وفات پائی، اور اپنی یادگار ہمیشہ کے لئے چھوڑ گئی،

آبادی | حکمرانون نے اس ملک کو آباد کرنے مین بڑی کوشش کی، متعدد گاؤن بسائے، مثلاً
چانہ، نبیر، پہالہ، ڈانگلی، اکبر آباد، گلیانہ، راولپنڈی، وغیرہ، جن باغی قومون کو شکست دے کر باہر
نکال دیا جاتا، یا خود بھاگ جاتین، پوٹھوار کے حکمران کچھ عرصہ کے بعد جب امن اور سکون ہو جاتا
تو پھر واپس آنے کی اجازت دے دیتے، اس سے آبادی مین کمی نہین ہونے پاتی، آبادی کو برقرار
رکھنے کیلئے تالاب بنوائے قحط کے ایام مین غریبون کی بیحد مدد کرتے، تاکہ بھوکون کو فاقہ سے باہر نہ جانا پڑے،

حب وطن | اس قوم مین اپنے وطن کی محبت بدرجۂ اتم ہے، بابر بادشاہ نے اپنے فتوحات کے دو حصے کرکے جب اس قوم
کو دونون مین سے ایک لینے کا اختیار دیا، تو ان لوگون نے دوسرے حصے کے بجائے اپنے وطن کو ترجیح دی، اسی طرح اس قوم کے
سردار کابل، سندھ، اودھ اور متعدد مقامات پر حاکم بنا کر بھیجے گئے، اور جاگیرین بھی انکو ملین، مگر اپنے وطن کو یہ نہ بھولے
اور وطن چھوڑ کر کسی دوسری جگہ آبادی نہین بسائی، یہی سبب ہے کہ پوٹھوار اور پڑوس کے ملک کشمیر کے علاوہ کسی علاقہ مین ان کی کوئی
مستقل آبادی نظر نہین آتی،

تنبیہ" مؤلف نے یہ کتاب حاکم وقت کی فرمایش سے لکھی ہے، اسلئے یہ خوشامد اور مبالغہ سے خالی نہین ہے، لیکن راقم الحروف
نے اس مقدمہ مین صرف وہی اوصاف لئے ہین جو صحیح اور مبالغہ سے خالی معلوم ہوئے،

ترجمہ | ترجمہ کی نسبت راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ جس قدر ممکن ہو سکا صاف اور سادہ زبان مین مطلب ادا کرنے کی کوشش
کی ہے، پیچیدہ جملون کو ہر جگہ صاف کر دیا ہے، البتہ فارسی نظمون کا صرف ترجمہ کر دیا ہے، اگر نظم بھی بالمقابل ہو تو بہت
ہی بہتر ہو، اور یہی حال پوٹھاری زبان کا ہے، جس محنت کاوش اور تاریخی کتب کی ورق گردانی کی ضرورت تھی
مین نے اس مین کمی نہین کی، پھر بھی یہ نہین کہا جا سکتا کہ غلطیون سے یہ کتاب مبرا ہو گی، اہل علم سے درخواست ہے کہ ان لغزشون سے
مجھے آگاہ فرما کر شکر گذار فرمائین گے، وفوق ذی کل علم علیم، وما توفیقی الا باللہ،

———.———

چند کتابون کے قلمی نسخے

(۱)

از مولینا سید عبد الرؤف صاحب ندوی، اورنگ آباد گیا،

دیوان برہمن

ماہ مارچ و مئی ۴۳ئہ کے معارف مین پنڈت چندربھان برہمن کی تصانیف و حالات اور دیوان سے بحث کی جاچکی ہے، دیوان برہمن کا ایک عمدہ نسخہ مولنا شیخ نور علی محدث سہسرامی[1] کے کتبخانہ مین بھی دیگر علمی وادبی نوادر کے ساتھ موجود ہے،

دیوان مذکور لیلی مجنون منظوم فارسی از ہاتفی کے ہمراہ ایک ہی شیرازہ سے بستہ ہے، دیوان نامکمل ہے، ردیف الف سے دال تک مسلسل ہے، باقی حصہ ناقص ہے، خاتمہ کتاب پر یہ عبارت ہے "تمام شد دیوان برہمن سنہ ۱۲۰۹ فصلی" کاتب کا نام مذکور نہین، مگر کتابت پختہ اور عمدہ نستعلیق ہے، کل ۱۱۹ غزلین ہین، تقطیع کتاب ۹ انچ طویل اور ۶ انچ عریض ہے، ہر صفحہ پر ۱۰ سطرین ہین، کاغذ اردونی، ناصری گنجی ہے، چند اشعار متفرق ردیف سے لطف اندوزی کے لئے ذیل مین پیش ہین،

اے برتر از تصور و وہم و گمان ما
اے درمیان ما و برون از میان ما

مانند غنچہ گرچہ خموشیم با تمن
لیکن برابر است چو بلبل زبان ما

[1] محدث موصوف کا تذکرہ معارف بابتہ ماہ فروری ۴۹ئہ مین تفصیل سے آچکا ہے انکے اخلاف مین مولوی حکیم محمد فخر الحسن صاحب سہسرامی مین جنکی ملکیت مین کتب خانہ مذکور محفوظ ہے گر دیگر نوادر علمی وادبی کے ساتھ دیوان مذکور کے نسخہ کو بھی علحدہ کرنیکا خیال رکھتے ہین

بکشا وچو در صحن چمن بند قبا را
بوے دگر افزود دم باد صبا را

ارباب نظر بر اثر شاہد مقصود
در راہ طلب دیدہ گذارند نپا را

کیفیت احوال جہان در نظرم بود
آن روز کہ بر آب نہادند بنا را

فروغ دل ز فیض بادہ روشن شود پیدا
دماغ رفتہ از سیر گل و گلشن شود پیدا

کجا پنہان کنم این گریۂ طوفان خونین را
کہ گر در آستین گم گردد از دامن شود پیدا

کردم شبے خیال تو در دیدہ میہمان
ریزد بجائے اشک بدامن آفتاب

گذارد قافلہ فیض در شب بارت
فروغ صبح طرب در شب سیاہ طلب

مارا بکار ہاے جہان احتیاج نیست
آزادہ را بسود و زیان احتیاج نیست

رمزیست درمیان دل ما جلوہ عشق
تقریر شوق را بزبان احتیاج نیست

قرار در شکن زلف یار خواہم کرد
باین قرار دل بے قرار شد باعث

بقدر حاجت خود ہر کسی طلبگار است
جہانیان ہمہ باشند در جہان محتاج

مراز غارت گلہا روے او چہ زیان
کہ ہست در چمن خویش باغبان گستاخ

ز روے صدق برہمن قدم براہ بنہ
کہ رہ روان رہ عاشقی ریا نکنند

اشعار برہمن صوفیانہ خیالات سے لبریز اور موحدانہ عقائد سے پر ہین،

(۲)

از جناب عبد الباسط صاحب دہلوی، اجمیری دروازہ دہلی،

منشآت برہمن

معارف کی ماہ مارچ اور ماہ مئی ۴۳ئہ کی اشاعتون مین "منشآت برہمن" پر کافی بحث ہوئی ہے، خاکسار کے پاس بھی منشآت برہمن کا ایک قلمی نسخہ ہے، جس کا سنہ کتابت ۱۱۱۱ھ ہے، صفحات سادہ، کاغذ

معمولی، خط صاف اور تحریر جلی ہے، کتاب کسی قدر کرم خوردہ ہے، مگر مطالعہ مین چندان حارج نہین، کتاب کے ہر صفحہ پر ۱۰ سطرین ہین، کل صفحات ۱۲۶ ہین، اس نسخہ مین ایک دیباچہ بھی ہے، جو چندربھان برہمن کے زور قلم کا نتیجہ ہے، اور جس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے،

بسم اللہ الرحمن الرحیم

چون از عنفوانِ شباب این برہمن عقیدت کیش را میل و رغبت بدریافت دقائق شعر و انشا بہم رسید، بعد فراغ مطالعۂ کتب و تواریخ و نسخہ ہائے نظم و نثر متقدمین و متاخرین بمقتضائے سعادت ازلی نفس خدمت و عبودیت دربارگاہ سلاطین پناہ، سلیمان جاہ، جمشید بارگاہ و صحبت وزرائے عظیم الشان مثل عضد الخلافۃ آصف خان، رکن السلطنت اسلام خان، سپہ سالار و علامۃ العصر والدوران افضل خان، ارسطو فطرت سعد اللہ خان، وزیر اعظم معظم خان، افلاطون شیم جعفر خان درست نشست و خدمت منظر (؟) مسودہ فراین بدین مور ضعیف تعلق یافت و اشعار این ذرۂ بے مقدار بدرجۂ تحسین رسیدہ در اندک ایام دیوان غزل و مثنوی نسخہ چند مثل گلدستۂ چہار چمن و تحفۃ الانوار و کارنامہ و تحفۃ الفصحا و مجمع الفقرا و یاد داین را ترتیب داد، از ہنگامی کہ این نیازمند قلم بدست گرفتہ رقعات متفرقہ در ہر باب خصوص در امور (معہود) خیر نوشتہ اگر نقل آن را احاطہ می شود نسخہ دیگر ترتیب می یافت الحال بتحریر بعضی از ان نوک قلم را اجازت می دہد و این نسخہ را کہ مشتمل است بہ نقل عرائض کہ بدرگاہ آسمان جاہ ارسال داشتہ و رقائم خطوطے کہ بوزرائے نامدار و بزرگان روزگار و امیران بلند قدر و دیگر عزیزان سخن سنج مرقوم قلم شکستہ رقم گردیدہ بمنشآت برہمن موسوم می سازد امید کہ پسند طبع خوردہ شناس ارباب سخن گردد باصلاح منت برین نیازمند گزارند،

اس کے بعد عرائض کا سلسلہ شروع ہوتا ہے، عرائض کے لحاظ سے کتاب کو دو قسمون مین منقسم کیا گیا ہے پہلی قسم مین وہ خطوط ہین، جو شہنشاہ شاہجہان اور عالمگیر[1] کو تحریر کئے گئے ہین، دوسری قسم مین اس عہد کے وزراء، امراء، علماء اور شرفا وغیرہ کو بترتیب مراتب مخاطب کیا گیا ہے،

معارف مارچ ۴۷ء مین تحریر ہوا ہے کہ پہلی عرضی "چون ادائے شکر نعمائے حضرت صمدیت" سے شروع ہوتی ہے، لیکن اس نسخہ مین ایسا نہین، بلکہ پہلی عرضی اس طرح شروع ہوتی ہے، (رنگین حروف مین)

قسم اول مشتمل بر نقل عرائض کہ بدرگاہ آسمان جاہ ارسال نموداشتہ

کمترین بندگان عقیدت نشان پندربھان بعد از ادای لوازم بندگی و عقیدت و تقدیم مراسم اخلاص و عبودیت ذرہ وار بموقف عرض باریافتگان محفل جاہ و جلال و استادہای بزم دولت (و) اقبال می رساند کہ بروزے کہ بہرہ از خدمت سراسر سعادت مرخص شدہ میخواست کہ در عرصہ یک ہفتہ بمطلب رسد چون برفاقت کسان زبدہ راجہای والا تبار مامور بود و بپائی مردی آنہا طی مسافت نمودہ روز مبارک دوشنبہ بتاریخ بست یکم شہر ذی الحجہ ۲۸ سنہ بہ اودی پور رسید الخ،

کتاب کا خاتمہ اور سنہ کتابت اس طرح ہے،

تمام شد نسخہ منشآت برہمن بروز چہار شنبہ بتاریخ بست و یکم شہر ربیع الاول بوقت سپہری از دست بندہ بدہ چند ولد سہا جیت این ہمل (؟) شاگرد میاں نجف خان محمد رضی الدین در سنہ یکہزار و یکصد ہفت ہجری النبویہ و مطابق سنہ فصلی باختتام پیوست،

مفتاح الفلاح ؟

معارف بابت ماہ دسمبر ۴۶ء مین مفتاح الفلاح کے متعلق آپ کا مضمون نظر سے گذرا، اس کا ایک

---

[1] پہلی قسم مین دو آخری عرضداشتین عالمگیر کے نام ہین پہلی عرضداشت مین اسکو تخت نشینی کے وقت مبارکباد پیش کی گئی ہے اور دوسری مین اپنی جوانی کے رخصت ہونے اور بڑھاپا آجانے کی وجہ سے مستعفی ہونے کی درخواست کی ہے،

نسخہ میرے پاس بھی ہے، جس کا مجھے یقین ہے کہ یہ مصنف کا خود نوشتہ ہے،

کتاب کی تقطیع ۱/۲ ۸" × ۱/۲ ۵"، کاغذ نفیس، سفید اور چکنا، جلد پرانی ہے، لیکن اصل نہیں، تعداد صفحات ۳۳۵ (کتاب پر صفحات درج نہیں میں شمار کئے گئے ہیں) ہر صفحہ پر ۱۹ سطرین، فہرست ابواب موجود نہیں، بلکہ سرورق پر صرف کتاب کا نام شنگرفی رنگ میں اس طرح تحریر ہے، "مِفْتَاحُ الْفَلَاحْ"،

سرورق کی پشت پر جہان سے کتاب کا آغاز ہوتا ہے، نہایت عمدہ سنہری کام ہے، جو رنگ برنگ کے بیل بوٹون سے آراستہ قسم قسم کے نقش و نگار سے پیراستہ ہے، اس صفحہ کو عروس روز اوّل کی طرح "عروس صفحۂ اوّل" کہا جائے تو بجا ہے، بہرحال کتاب بھی اسی طرح نہایت خوش خط اور جلی قلم سے لکھی ہوئی ہے، اور اس پر جابجا حاشیہ آرائی کی گئی ہے، حاشیے بقول لفٹنٹ کرنل خواجہ عبدالرشید صاحب واقعی اصل کتاب سے زیادہ حسین معلوم ہوتے ہیں، کتاب میں جہان جہان دعائیں لکھی ہوئی ہیں، ان کا بین السطور ترجمہ فارسی زبان میں شنگرفی روشنائی سے خوش خط لکھا ہوا ہے، جو بہت دیدہ زیب ہے، کتاب اس طرح ختم ہوتی ہے،

.... فرغت بعون الله من تالیفه مع تراکم

افواج العلائق وتلاطم امواج العوائق وتوزع البال

بالحل والترحال فی اوائل العشر الثالث من شهر الثانی

من السنة الخامسة من العشر الثانی بعد الالف

ببلدة گنجه وانا اقل الانام محمد المشتهر

ببهاء الدین العاملی تجاوز الله عن سیئاته

والحمد لله اولاً وآخراً وظاهراً وباطناً

برحمتك یا ارحم الراحمین

خواجہ صاحب موصوف کے نسخہ میں جو سنہ ۱۱۵۶ھ درج ہے، وہ اصل کتاب کے سنہ تصنیف کے اعتبار سے غلط ہے، جیسا کہ معارف نے لکھا ہے، کتاب مفتاح الفلاح کے خاتمہ کی عبارت کے بعد یہ سنہ ۱۱۵۶ھ غلط ہے لیکن کتابت کے لحاظ سے صحیح ہے، جس کاتب نے اس کتاب کو نقل کیا تھا اس نے اپنا سنہ کتابت درج کر دیا ہے، چنانچہ مصنف کے خاتمہ کے بعد کاتب کا اپنا خاتمہ لکھنا اس بات پر دال ہے،

کتاب کے آخری ورق کے ذیل میں جہان کتاب مذکورۂ بالا خاتمہ پر ختم ہوتی ہے، یہ فقرہ لکھا ہوا ہے،

هذا عطیاً من السید الاجل مولانا سید مختار الرضوی ارسلنی

من الکشمیر حین کنت فی بلد اللاهور ...... (مٹا ہوا ہے، یا بندہ کا نام معلوم ہوتا ہے)

عفی الله عن جرائمه،

اس فقرہ سے ظاہر ہے کہ یہ کتاب لاہور بھیجی گئی ہے، اور خواجہ صاحب کی کتاب بھی لاہور ہی میں لکھی گئی[1]، چنانچہ یہ اغلب ہے کہ موصوف کا نسخہ اسی کتاب کی نقل ہو،

مثنوی زادُالمسافرین

معارف بابتہ دسمبر سنہ ۴۶ء میں اس مثنوی کے متعلق کافی معلومات حاصل ہوئیں، اس کا ایک نسخہ راقم کے پاس بھی ہے، جو سنہ ۱۲۳۵ھ کا لکھا ہوا ہے، خط صاف، کاغذ معمولی، تعداد صفحات ۹۶ اور ہر صفحہ پر ۱۵ سطرین ہیں، اشعار کی مجموعی تعداد ۱۴۰۸ ہے، لیکن سید مقبول احمد صاحب صمدنی نے ۱۴۵۶ تحریر فرمائی ہے، یہ واضح ہے کہ موصوف کا نسخہ واقعی قابلِ قدر اور قدامت کے لحاظ سے بیش قیمت اور نایاب ہے، اسی بنا پر میں اپنے نسخہ کے متعلق زیادہ لکھنا مناسب نہیں سمجھا، ہان صرف اس قدر بتا دینا چاہتا ہون، کہ جب میں نے موصوف کے نقل کردہ اشعار کا اپنے نسخہ کے اشعار سے مقابلہ کیا تو ان دونوں نسخوں میں الفاظ کے اعتبار سے کافی رد و بدل پایا، اس کے علاوہ صمدنی صاحب کے نسخہ میں کئی اشعار بھی نہیں ہیں، حالانکہ میرے نسخے میں موجود ہیں، مثلاً،

---

[1] جیسا کہ ان کی کتاب کے خاتمہ سے معلوم ہوتا ہے،

بشنو پسرا بیانِ حالت علم جدلیست قیل و قالت

کے بعد یہ شعر ان کے نسخہ مین نہین ہے

پندار خود از میانہ بردار توحید تو ترک تست ہش دار

یا این جانے حوالہ نیست...... کے بعد یہ دو اشعار ہے

ہان اے دلِ گم شدہ کجائی کز خود نفسی بخود دنیائی

میسوز ترا ہمین تمام است سودا چہ پزی کہ کار خام است

یا یک نکتہ او کہ جان..... کے بعد یہ اشعار ہے

در باغ حقیقت این نہالیست کز وی ہمہ باغ را جمالیست

رو حش بنشاند عقل پرورد نادان بر این درخت کم خورد

یہ صرف اسی نسخہ کی تخصیص نہین، بلکہ میرے نسخہ مین بھی بہت سے اشعار نہین ہون گے، اور کافی ردو بدل ہو گا، جیسا کہ اشعار کی مذکورہ مجموعی تعداد کے موازنہ سے ظاہر ہوتا ہے، جب ان چند اشعار کے مقابلہ کرنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے، تو تمام اشعار کا مقابلہ کئے جانے کی صورت مین کیا کچھ نہ ہوگا،

تاریخ سندھ

(اردو مین سندھ کی پہلی جامع محققانہ تاریخ)

ہندوستان مین مسلمانون کا پہلا قافلہ سندھ مین اترا تھا، اور انکی پہلی حکومت یہین قائم ہوئی تھی، اور وہ ایک ہزار سال سے اوپر یہان کے حکمران رہے، آج بھی سندھ کے در و دیوار سے ان کے آثار نمایان ہین، لیکن اسکے باوجود اردو مین اسلامی سندھ کی کوئی مفصل و محققانہ تاریخ نہین تھی، دار المصنفین نے تاریخ ہندوستان کے سلسلہ مین سندھ کی بھی یہ جامع و محققانہ تاریخ مرتب کرائی ہے، اس مین اسلامی سندھ کی ایک ہزار سال کی سیاسی علمی تمدنی تاریخ کی تفصیل ہے، مسلمان قدیم اسلامی خطہ کی تاریخ فراموش کر چکے تھے اب پھر اس کو یاد کرنے کی ضرورت ہے،

مرتبہ: مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی دسنوی سابق رفیق دار المصنفین اعظم گڈھ

استفسار و جواب

احادیثِ عاشوراء

جناب ابو احمد محمد عبد اللہ صاحب مقلح

(۲ مرتسر)

۱- روایاتِ کتبِ حدیث مین بیان کیا گیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت فرما کر جب روز مدینہ منورہ مین داخل ہوئے تھے اس روز یہود نے عاشورا کا روزہ رکھا ہوا تھا، اس روزہ کی وجہ یہود نے یہ بیان کی تھی، کہ یہ روزہ شکریہ مین رکھا جاتا ہے، کہ اس تاریخ کو اللہ پاک نے موسیٰ علیہ السلام کو فرعون پر فتح دی تھی، اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا، کہ تمھاری نسبت مین موسیٰ علیہ السلام سے زیادہ تر قریب ہون، اس لئے آیندہ سال سے مین بھی عاشورا کا روزہ رکھون گا، بدین وجہ اس دن سے آج تک مسلمانون مین عاشورا کا روزہ محرم کی دس تاریخ کو رکھا جاتا ہے، اس پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے، کہ حضور کا داخلہ مدینہ منورہ مین ماہ ربیع الاول مین ہوا تھا، اس لئے یہود نے عاشورا کا روزہ ربیع الاول مین رکھا تھا، پھر مسلمانون مین عاشورا کا روزہ عاشورہ محرم کے دن کیون رکھا جاتا ہے؟

۲- روایات کتب حدیث مین ہجرت فرما کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مدینہ منورہ مین دوشنبہ کے دن داخل ہونا بیان کیا جاتا ہے کہ وہ دن یہود کے عاشورہ کا تھا، اور علامہ البیرونی نے جو علم ہیئت کے عالم ہین، کتاب آثار الباقیہ عن القرون الخالیہ مین لکھا ہے کہ

یہود کا عاشورہ حضور کے داخلہ مدینہ منورہ کے ایک دن کے بعد سہ شنبہ کے دن تھا، اندرین صورت روایاتِ کتبِ احادیث سے علامہ البیرونی کے قول کا غلط ہونا، اور علامہ البیرونی کے قول سے روایاتِ کتبِ حدیث کا مختلف ہونا لازم آتا ہے، اس لئے ان مین سے جو امر صحیح ہو، اس کا مدلل بیان کیا جائے،

معارف: ۱- کتب حدیث مین یہ نہین درج ہے کہ جس روز حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ مین داخل ہوئے، وہ یہود کے عاشورا کا دن تھا، حدیثون مین جو کچھ مذکور ہے، وہ یہ ہے کہ ہجرت کے بعد حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود کو عاشورا کے دن روزہ رکھتے دیکھ کر ایک دن اس کی وجہ پوچھی تو انھون نے اسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سنت قرار دیا، اس لئے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم سے زیادہ ہم لوگون کو اتباعِ موسیٰ کا حق ہے،

۲- علامہ بیرونی نے محض قیاس تخمین سے یہ فرض کر لیا، کہ جس عاشورا کی بابت حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور یہودی میں گفتگو ہوئی تھی، وہ یہود کے صوم کفارہ کا دن تھا، اس بے بنیاد مفروضہ نے حدیث کو حساب سے لڑا دیا، ورنہ اپنی جگہ پر حدیث بھی درست ہے، اور علامہ بیرونی کا حساب بھی،

یہودی سنین و شہور | یہودی مہینون کی اسلامی مہینون کے ساتھ تطبیق کے لئے ضروری ہے کہ یہود کے ایام و سنین کو بھی طرح ہم سمجھ لین،

حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل کو حکم دیا تھا، کہ ابیب یعنی نیسان کے مہینہ سے اپنا حساب شروع کیا کرین[1]، اس ماہ کی پندرھوین تاریخ کو حضرت موسیٰ نے عید فطیر اور یوم حصاد اور عشر ارض دینے کا دن مقرر کیا تھا[2]، اس بنا پر یہود کو ضرورت ہوئی کہ ان کا سال اس طرح شروع ہو کہ ۱۵ ابیب ہمیشہ فصل کاٹنے کے دنون مین پڑے اور کبھی اس روز شنبہ نہ ہو، اس کے ساتھ ان کو اس حکم کا لحاظ بھی رکھنا تھا کہ

[1] خروج ۱۲: ۲، [2] خروج ۲۳: ۱۴ تا ۱۹ مع احبار ۲۳: ۶

خدا نے چاند کو اوقات کا شمار بتانے کے لئے بنایا ہے[1]، اس کے لئے انھون نے سنین شماری کا ایک طویل طریقہ ایجاد کیا، جس کی صرف دو دفعات کا ذکر ہمارے لئے ضروری ہے،

۱- ہر ۱۹ برس مین، ۷ برس ۱۳ ماہ کے ہون،

۲- زائد مہینہ کو برسون مین تقسیم کرنے کے کئی قواعد ہین، شام مین قاعدہ بہزیجوح رائج تھا، عرب کے لوگ اسی قاعدہ سے واقف تھے، اس کا مطلب یہ ہے کہ بہزیجوح کے حروف کی قیمت جس سال کا عدد ہو اس کے آخر مین زائد ماہ کا اضافہ کیا جائے،

سنہ خروج سے سنہ ۱۰ھ تک صحیح حساب کے مطابق ۲۰۴۲ برس شمسی گذرے، اس مدت کو ۱۹ برسون پر تقسیم کیا جائے تو ۱۰ بچتے ہین، احادیث مین وارد ہے کہ حجۃ الوداع کے دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آج کے روز

استدار الزمان کھیئاتہ یوم	زمانہ چکر کاٹ کر اس ہیئت پر آ گیا، جو آفرینش
خلق اللہ السّمٰوٰت والارض	کے دن تھی، (بخاری کتاب التفسیر)

ابن حجر عسقلانی نے لکھا ہے کہ استدارۂ زمان کا مطلب جمعہ ۹ ذی حجہ سنہ ۱۰ھ کو آفتاب کا برج حمل مین آنا، اور استوائے لیل و نہار ہے، اس سے معلوم ہوا کہ حجۃ الوداع کا مہینہ یہود کے ماہ ابیب کے مطابق تھا، بغوی نے معالم (سورۂ مائدہ) مین لکھا ہے کہ جمعہ ۹ ذی حجہ سنہ ۱۰ھ کو یہود، نصاریٰ اور مجوس کی عیدین تھین، مجوس سے ہم کو بحث نہین، حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل کے لئے ذیل کی مختلف مذہبی تقریبون کے لئے تقریباً پورے ماہ ابیب کو عید کا ایام بنا دیا تھا،

ا ابیب :- مقدس مجمع کا دن، ہماری بولی مین یوم الجمعہ

۷ ابیب :- " "

[1] زبور ۱۰۴: ۱۹

۱۰ ابیب :- قربانی کے جانور خریدنے کی تاریخ، اس دن روزہ بھی رکھا جاتا تھا،

[illegible] ابیب :- ایام قربانی،

۱۵ ابیب :- یوم حصاد، یوم زکوٰۃ،

ان باتوں کے پیش نظر اب یہود کے مہینوں کو ایام نبوت کے اسلامی مہینوں سے ذیل کے نقشہ میں مطابق کرکے دیکھئے،

سنہ خروج	ماہ ابیب	ماہ تشری	ماہ آذر	ماہ کبیسہ
سنہ ۲۰۱۵	(۱) جمادی ۲	ذی حجہ	جمادی ۱	۰
ب سنہ ۲۰۱۶	(۲) جمادی ۲	ذی حجہ	جمادی ۱	جمادی ۲
سنہ ۲۰۱۷	(۳) رجب	محرم	جمادی ۲	۰
سنہ ۲۰۱۸	(۴) رجب	محرم	جمادی ۲	۰
(۵) سنہ ۲۰۱۹	(۵) رجب	محرم	جمادی ۲	رجب
سنہ ۲۰۲۰	(۶) شعبان	صفر	رجب	۰
ن سنہ ۲۰۲۱	(۷) شعبان	صفر	رجب	شعبان
سنہ ۲۰۲۲	(۸) رمضان سنہ ۱ قبل ہجرت	ربیع ۱ سنہ ۱ھ	شعبان	۰
سنہ ۲۰۲۳	(۹) رمضان سنہ ۱ھ	ربیع ۱ سنہ ۲ھ	شعبان	۰
ی سنہ ۲۰۲۴	(۱۰) رمضان سنہ ۲ھ	ربیع ۱ سنہ ۳ھ	شعبان	رمضان
سنہ ۲۰۲۵	(۱۱) شوال سنہ ۳ھ	ربیع ۱ سنہ ۴ھ	رمضان	۰
سنہ ۲۰۲۶	(۱۲) شوال سنہ ۴ھ	ربیع ۲ سنہ ۵ھ	رمضان	۰
ج سنہ ۲۰۲۷	(۱۳) شوال سنہ ۵ھ	ربیع ۲ سنہ ۶ھ	رمضان	شوال
سنہ ۲۰۲۸	(۱۴) ذی قعدہ سنہ ۶ھ	جمادی ۱ سنہ ۷ھ	شوال	۰
سنہ ۲۰۲۹	(۱۵) ذی قعدہ سنہ ۷ھ	جمادی ۱ سنہ ۸ھ	شوال	۰
و سنہ ۲۰۳۰	(۱۶) ذی قعدہ سنہ ۸ھ	جمادی ۱ سنہ ۹ھ	شوال	ذی قعد
سنہ ۲۰۳۱	(۱۷) ذی حجہ سنہ ۹ھ	جمادی ۲ سنہ ۱۰ھ	ذی قعد	۰
ح سنہ ۲۰۳۲	(۱۸) ذی حجہ سنہ ۱۰ھ	جمادی ۲ سنہ ۱۱ھ	ذی قعد	ذی حجہ
سنہ ۲۰۳۳	(۱۹) محرم	رجب	ذی حجہ	۰

یہودی روزے قبل اس کے کہ ہم احادیث عاشوراء پر بحث کریں، یہود کے چند روزہ دن کا ذکر کریں گے، جو اُن کے مہینوں میں کسی ماہ کی ۹ یا دس کو پڑتے تھے،

(۱) صوم مریم :- ابوریحان بیرونی نے لکھا ہے، ۱۰ نیسان کو حضرت مریمؑ اخت موسیٰؑ کی وفات کے دن یہود روزہ رکھتے تھے،

(۲) صوم تابوت :- ابوریحان بیرونی کے مطابق، ۱۰ آیار کو یہود اس لئے روزہ رکھتے تھے کہ اس دن عیلی کاہن کے زمانہ میں تابوت مقدس کو دشمن چھین لے گئے تھے،

(۳) یوم الخراب ۱۰ اراؤب کو نبوزردان نے خانۂ خدا سمیت سارے شہر یروشلم کو جلا دیا تھا، اس کے غم میں بھی روزہ رکھا جاتا تھا،

(۴) صوم کفارہ: ۱۰ ارتشری کو رکھا جاتا تھا، یہ درحقیقت وہ دن تھا جس دن قرآن مجید کے بیان کے مطابق حضرت موسیٰؑ نے کہا تھا،

یٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْا اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ	اے قوم تم نے بچھڑے کو اپنا کر اپنے نفسوں پر ظلم کیا، اس لئے اپنے رب کی طرف پلٹو اور اپنے (خطاکار) افراد کو قتل کردو،